ماہنامہ
بیداری
حیدر آباد

مدیر
☆☆☆
حافظ محمد موسیٰ بھٹو

زیر اہتمام
☆☆☆
سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ
400-بی لطیف آباد4-حیدر آباد
E-MAIL
m.moosabhutto@gmail.com
www.bedarimillat.com

موبائل نمبر:
03463216078

جلد انیسواں دسمبر-جنوری2025
قیمت:25روپے،سالانہ:300روپے

قرآن کا پیام (مستقل سلسلہ)	محمد موسیٰ بھٹو	۲
ہمارے نام		
گلوبل سوسائٹی میں	مولانا زاہد الراشدی	۲۲
دینی تعلیم کے نئے تقاضے		
موبائل فون کا استعمال	انوار الحسن	۳۰
رحمت یا زحمت		
وقت اور زندگی کی قدر و قیمت	مولانا عبد المتین	۳۴
اور اس کے استعمال کی صحیح صورت		
بدگمانی کے اسباب اور	محمد عبد اللہ قاسمی	۴۵
معاشرے پر پڑنے والے اس کے اثرات		
جدید ٹیکنالوجی کے کرشمے	ریٹائر کمانڈر محمود اقبال صاحب	۵۲
سیرت کا ایک روشن پہلو	مولانا سلیمان ندوی	۵۵
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں	رح	۶۶
ہمارے کچھ اہم معاملات (مستقل سلسلہ)	حکایت رومی	۶۸
احادیث نبوی کی روشنی میں	محمد موسیٰ بھٹو	

پبلشر: محمد موسیٰ بھٹو نے یادگار پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ 400بی لطیف آباد-4-حیدر آباد سے شائع کیا

محمد موسیٰ بھٹو

مستقل سلسلہ

قرآن کا پیام

ہمارے نام

ایمان اور تقویٰ کے نتیجے میں

رحمتوں کے دروازے کھولنے کا وعدہ

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓي اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ
(سورۃ الاعراف آیت ۹۶) (اور اگر یہ دیہاتی ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان کے لئے آسمان اور زمین کی برکات کے (دروازے) کھول دیتے)۔

اس آیت میں ایمان اور تقویٰ کے نتیجے میں آسمان اور زمین کی برکات کے دروازے کھولنے کا وعدہ فرمایا گیا ہے، لیکن یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ایسی عظیم نعمت کے عطا فرمانے کے وعدہ کے باوجود ہر دور میں انسانوں کی اکثریت ایمان اور تقویٰ کی طرف آنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ موجودہ دور میں تو مسلمانوں کی اکثریت ایمان کی رسمی حالت پر ہی اکتفا کرنے کو سب کچھ سمجھتی ہے۔

اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ نفس پرستی پر مبنی جو معاشرہ متشکل ہوتا ہے، جو مقتدر طبقات (جو اکثر نفس پرست ہوتے ہیں) کا قائم کردہ ہوتا ہے، اس معاشرے کے اثراتِ بد اتنے ہمہ جہت ہوتے ہیں کہ افراد اس کی جکڑ بندیوں سے آزاد نہیں ہو پاتے، دوسرے الفاظ میں مقتدر طبقات ہر دور میں جو ریاستی نظام تشکیل دیتے ہیں، وہ ریاستی نظام عام طور پر ایمان (کی گہرائیوں) اور تقویٰ کے منافی ہوتا ہے، اس ریاستی نظام کی گرفت

اتنی سخت ہوتی ہے کہ ایمان اور صاحب تقویٰ افراد کو کام کرنے کے مواقع نہیں ملتے یا ان کی بات سننے پر آمادگی نہیں ہوتی۔

پھر چونکہ خواہشات نفس اور آزادانہ طرز زندگی گزارنے میں لذت ہوتی ہے، اس لئے لوگوں کے لئے اس لذت سے دستبردار ہو کر تقویٰ کی زندگی گزارنا دشوار ہوتا ہے۔

نفس کی حیوانی خواہشات کی جکڑبندیوں کے ساتھ مادہ پرستی یا مادیت پسندی پر مشتمل معاشرہ کا جو اجتماعی دباؤ ہوتا ہے، وہ نہایت سخت ہوتا ہے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کو بڑی سخت آزمائش میں ڈالا گیا ہے کہ وہ اس دنیا میں بھی اعمالِ بد کے اثرات کی صورت میں سخت حالات سے دوچار ہو کر اللہ کے عتاب کا شکار بنتا ہے تو آخرت میں تو وہ اللہ کے شدید عتاب سے ہی دوچار ہوگا۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ نفس پرستی کی قوتوں کی گرفت سے بلند ہو کر افراد کا جو گروہ ایمان اور تقویٰ کی راہ پر گامزن ہوتا ہے، اس کے لئے اللہ کی طرف سے آسمان اور زمین کی رحمتوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔

محرومی کی بات ہے کہ ہم اس طرح کی آیتیں پڑھتے اور سنتے رہتے ہیں، لیکن ہماری طرز زندگی اور ہماری روش میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، گویا ہمیں اللہ کی اتنی عظیم نعمت کی ضرورت ہی درپیش نہیں، حالانکہ ہمارے حالات بتاتے ہیں کہ ہم اجتماعی طور پر افلاس، محتاجی اور دوسروں کی دست نگری کی حالت سے دوچار ہیں، اللہ ہماری حالت زار پر رحم فرمائے کہ اس کے بغیر کوئی صورت نہیں۔

نفس کو سنوارنے سے فوز و فلاح کا وابستہ ہونا

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (سورۃ الاعلیٰ آیت ۱۴) (بے شک وہ مراد کو پہنچا جس نے نفس کو پاک کیا)۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (سورۃ الشمس آیت ۹۔۱۰) (جس نے

اپنے نفس کو پاک رکھا (سنوارا) وہ مراد کو پہنچ گیا اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا)۔

نفس کو سنوارنے اور پاکیزہ بنانے کا کام ایسا ہے، جس سے دین کے سارے کام وابستہ بھی ہیں، تو ساتھ ساتھ آخرت میں کامیابی کا بھی اس پر مدار ہے، نفس وہ قوت ہے جو اللہ کی الوہیت کے مقابلے میں سامنے آتی ہے، دنیا میں ہونے والے سارے فساد میں نفس کی قوتوں ہی کا کردار رہا ہے اور اب بھی اسی کا کردار ہے، نفس دوسروں کے مقابلے میں اپنی بڑائی چاہتا ہے، دوسروں کو حقیر دیکھنا چاہتا ہے، نفس زیادہ سے زیادہ دولت اور راحت کا سامان چاہتا ہے، نفس شہرت اور نام وری چاہتا ہے، نفس دوسروں پر بالادستی چاہتا ہے، نفس مزاج کے خلاف ہونے والی باتوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، نفس عبادت اور اطاعت کے لئے آسانی سے تیار نہیں ہوتا، اس کے لئے اسے جبراً آمادہ کرنا پڑتا ہے، نفس، حسد کا شکار ہوتا ہے، دین کے سارے کاموں میں نفس سست رفتاری میں مبتلا ہوتا ہے، جب کہ اپنی شان مان، شہرت اور اپنی عزت کے کاموں میں تیز تر ہوتا ہے۔

نفس کو مولانا رومی نے فرعون نفس کہا ہے، بزرگوں کا کہنا ہے نفس اپنی الوہیت پر ڈٹا رہنا چاہتا ہے، جو شخص نفس کی قوتوں سے دستبردار ہو کر اسے مکمل طور پر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں دیتا ہے، اور نفس کو بڑی حد تک تزکیہ کے مراحل سے گزارتا ہے، وہ شخص اپنی ذات اور معاشرے کے لئے خیر و برکت کا باعث بھی بنتا ہے تو وہ آخرت میں فلاح سے بھی ہمکنار ہو گا۔

قرآن کی مذکورہ آیتوں میں نفس کو سنوارنے کی اہمیت کو اجاگر فرمایا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے ہے کہ **اذھب الیٰ فرعون انہ طغی فقل ھل لک ان تزکیٰ** یعنی فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہو گیا ہے اسے کہو کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا تزکیہ ہو، یعنی تمہارے نفس کے سنورنے کی صورت پیدا ہو، اس پر فرعون نے اپنے

اعلیٰ رب ہونے کا دعوا کیا۔ نفس کی قوت ہر فرد کے ساتھ لگی ہوئی ہے، اس کو تزکیے کے مراحل سے گزارے بغیر اس کی فساد برپا کرنے کی حالت میں تغیر پیدا نہیں ہوتا، اس لئے بزرگوں کے ہاں نفس کو سنوارنے کے لئے راہ سلوک و محبت میں چلایا جاتا ہے۔ اور ذکر کے مجاہدوں سے نفس کی قوتوں کو پامال کرنے کی کاوش کی جاتی ہے، اس سے رفتہ رفتہ نفس میں تبدیلی واقع ہوتی ہے، وہ امارہ سے لوامہ اور لوامہ سے مطمئنہ کی حالت میں ترقی کرتا ہے، لیکن اس کے لئے مستقل مزاجی سے چلنا پڑتا ہے، اور اس میں کافی وقت لگتا ہے۔

انعام یافتہ افراد کی راہ پر گامزن ہونا

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ. (یااللہ) (ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے)۔

مذکورہ دعائیہ کلمات ایسے ہیں جو ہم ہر نماز میں روزانہ دسیوں بار ادا کرتے ہیں اور اللہ سے سیدھا راستہ دکھانے کی دعا مانگتے رہتے ہیں، سیدھا راستہ کون سا؟ انعام یافتہ لوگوں کا راستہ۔

ایک مفسر قرآن نے اس آیت کی تشریح میں لکھا ہے کہ یہاں اگر صراط القرآن والحدیث آتا، کہ یااللہ ہمیں قرآن و حدیث کا سیدھا راستہ دکھادے، لیکن قرآن و حدیث کے بجائے انعام یافتہ لوگوں کا ذکر اس لئے آیا کہ قرآن و حدیث کے الفاظ سے بہت سارے معنٰی نکلتے ہیں، جس کی وجہ سے افراد مختلف معنوں میں الجھکر سیدھے راستے کے بارے میں مذبذب ہو جاتے، بلکہ وہ قرآن و حدیث سے ایک دوسرے سے جداگانہ معنٰی و مفہوم مراد لینے لگتے، اس لئے کہ قرآن و حدیث کے ایک ایک لفظ کے بہت سارے معنٰی نکلتے ہیں، انعام یافتہ لوگوں کا راستہ ہی اس قابل ہے کہ اسے قرآن و حدیث کا متعین کردہ صحیح راستہ سمجھتے ہوئے اس راستے پر گامزن ہوا جائے۔

یہ بہت اہم نکتہ ہے، جو **انعمت علیھم** سے نکلتا ہے، اس نکتے کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اپنی ذاتی علمی تحقیق اور قرآن کے ذاتی فہم سے قرآن سے نئے نئے اہداف متعین کرنا اور نت نئے اہداف کو متعارف کرانا، یہ ہر دور میں بعض علمی مزاج کے حامل افراد کا خاصہ رہا ہے، اس دور میں تو انعام یافتہ لوگوں سے صرف نظر کرتے ہوئے قرآن کو اپنی ذاتی علمی تحقیق سے پیش کرنے کی روش میں کچھ زیادہ اضافہ ہوا ہے، جس کی وجہ سے اسلام کے اہداف میں بھی تبدیلی واقع ہو گئی ہے اور عبادت مقصود ہونے کی بجائے خارجی زندگی میں غلبہ دین یا معاشی حالات کی بہتری دین کا مقصود بن گیا ہے۔

یقیناً قرآن میں ہر دور کے حالات اور ضروریات کے لئے رہنمائی موجود ہے، اس لئے قرآن پر غور و فکر اور اجتہاد کرنا ضروری ہے، لیکن دین کے اہداف کے تعین یا دین کے بنیادی معاملات کے سلسلے میں انعام یافتہ لوگوں یعنی سلف صالحین کا تتبع انتہائی ناگزیر ہے، قرآن کی یہ آیت اس سلسلے میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔

مومنوں کی راہ کی مخالفت کرنے کا نقصان

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ۔ (سورۃ النساء آیت ۱۱۵)

(اور جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہونے کے بعد پیغمبر کی مخالفت کرے اور مومنوں کے راستے کے سوا دوسرے راستہ پر چلے تو ہم اسے ایسا کرنے دیں گے (لیکن قیامت کے دن) اسے جہنم میں داخل کریں گے)۔

اس آیت میں سبیل المومنین (مومنین کی راہ) پر چلنے کی جو تاکید فرمائی گئی ہے، وہ دراصل سلف صالحین، علمائے ربانیین اور بزرگان دین کی راہ ہے، امت لگ بھگ بارہ سو سال تک اس راہ پر چلتی رہی ہے، لیکن جدیدیت کی تیز فکری لہروں نے امت کے ذہین صاحبان علم

کو اپنی ذاتی تحقیق سے قرآن وسنت کو سمجھکر پیش کرنے اور قرآن سے نئے اہداف متعین کرنے کی راہ پر لگایا، ان کی فکر کے زیر اثر سلف سے جداگانہ اسلامی فکر اختیار کیا گیا۔

موجودہ دور میں مغربی طرز تعلیم اور مغربی افکار کے غلبے کی وجہ سے ذہنوں کی نشو ونما کچھ اس انداز سے ہوئی ہے کہ قرآن وسنت کو اپنے ذہن اور اپنی ذاتی تحقیق سے سمجھنے والے فضلا کی تقلید کا رجحان بڑھا ہے، جب کہ سلف صالحین کو کچھ سمجھا ہی نہیں جاتا، بلکہ اس طرف ذہن ہی نہیں جاتا کہ سلف صالحین بھی کوئی چیز ہیں، جو قرآن وسنت کے حقیقی فہم اور دین کے نصب العینی پیام کو سمجھنے کے لئے ہمارے لئے اتمام حجت ہیں، یہ آیت اس سلسلے میں واضح ہے کہ مومنیں جن کے نمائندے سلف صالحین، علمائے ربانیں اور بزرگان دین ہیں، ان کے قرآن وسنت کے راستے سے انحراف کے نتائج منفی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، اس طرح کے فرد کے لئے جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔

موجودہ دور میں چونکہ عقل ہی کو سب کچھ سمجھا گیا ہے، جدید افراد کی ساری ذہنی تربیت عقل کے زیر اثر ہوتی ہے، اس لئے ان کے لئے سلف صالحین کی اسلامی فکر کوئی معنیٰ نہیں رکھتی، سلف صالحین کی اسلامی فکر میں دل کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، اللہ کی محبت، فکر آخرت، تقویٰ، خشیت، اخلاص، اعمال اور سیرت وکردار کی پاکیزگی، عبادت، ذکر وفکر ان کی فکر کے مرکزی نکات یہی ہیں، جب کہ جدید اسلامی مفکروں کے فکر کے مرکزی نکات نظام کی تبدیلی، نظام ربوبیت، معاشی نظام کی بہتری، دنیا میں سربلندی، اقامت دین، سیاسی نظام کی تبدیلی وغیرہ ہے، چونکہ یہ چیزیں جدید ذہن کو متاثر کرتی ہیں، اس لئے اس طرح کے مفکرین کی فکر سے متاثر ہو کر سلف صالحین کی اسلامی فکر سے دوری کی روش اختیار کی گئی ہے۔

اب تو بات اس سے بھی زیادہ آگے بڑھ گئی ہے کہ جدید اسلامی مفکروں کی فکر کو بھی زیادہ اہمیت حاصل نہیں رہی، اب تو جدید افراد کی سوچ، طرز فکر اور مادی طرز زندگی تک

محدود ہو کر رہ گئی ہے، یعنی اسلام کی حقیقی راہ سے تو انحراف ہے ہی، لیکن اسلام کی خارجی زندگی میں جدوجہد والی فکر سے بھی ذہنی مناسبت باقی نہیں رہی۔

جب مادی طرز زندگی مقصود ہو جائے تو پھر باقی رہ ہی کیا جاتا ہے۔

ایمان کا دل کی گہرائیوں میں داخل ہوئے بغیر اسلام کا نامکمل ہونا

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (سورۃ الحجرات آیت ۱۴)

(دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے آپ فرمایئے تم ایمان نہیں لائے البتہ یہ کہو ہم اسلام لائے ہیں، اور ایمان تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا)۔

اس آیت میں اسلام قبول کرنے کے بعد ایمان کی گہرائیوں پر زور دیا گیا ہے اور جب تک دل پر محنت نہیں ہو گی، تب تک اسلام رسمی دینداری تک محدود ہو گا، اور اللہ کو جو اسلام مطلوب ہے، اس میں گہری دینداری اور ایمان ویقین کی مستحکم حالت موجود ہوتی ہے، ایمان کی گہرائی کے نتیجے میں جو خصوصیات پیدا ہوتی ہیں، انہیں کچھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

اللہ سے محبت پیدا ہوتی ہے، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں ذوق وشوق کی حالت پیدا ہوتی ہے، بُری عادتوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے، بُرائی سے نفرت پیدا ہوتی ہے، کردار میں رونق آجاتی ہے، اللہ کے لئے ایثار وقربانی کا مادہ پیدا ہوتا ہے، حمیت دین کی سعادت حاصل ہوتی ہے، اپنے دوسرے بھائیوں سے تعلقات میں بہتری آتی ہے، اعمال میں اخلاص پیدا ہوتا ہے، زندگی کا رنگ ڈھنگ بدل کر پوری طرح اسلام سے ہمہ آہنگی پیدا ہونے لگتی ہے، ملی معاملات میں آگے بڑھکر اپنے حصے کا کردار ادا کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

اسلام میں جب ایمان کی طاقت شامل ہو جاتی ہے تو مذکورہ صفات وخصوصیات پیدا ہونے لگتی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ایمان، اسلام کی تکمیل کا ذریعہ ہے، لیکن ایمان بنانے

اور ایمان کو دل کی گہرائیوں کا حصہ بنانے کے لئے مجاہدوں کی ضرورت ہے، ایمان کی یہ مطلوبہ حالت ایک دن میں یا جلد پیدا نہیں ہوتی، بلکہ ایمان کے ارتقائی مراحل کے لئے مجاہدوں کے دورانیہ سے گزرنا پڑتا ہے۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں ہم جیسے مسلمانوں کے حالات کی عکاسی فرمائی گئی ہے کہ وہ اسلام کا حصہ تو ہیں، لیکن ایمان بنانے کے لئے مجاہدوں کے لئے تیار نہیں ہیں، جس کی وجہ سے اسلام سے ہمہ آہنگ زندگی کی صورت پیدا نہیں ہوتی، اللہ کو جو اسلام مطلوب ہے، وہ دل کی حالت کو بدلنے والا ایمان ہے، جو فرد کو اسلام کے لئے پوری طرح متحرک اور فعال کر سکے اور فرد اسلامی زندگی کا نمونہ اور مظہر بن سکے۔

ایمان بہت بڑی نعمت ہے، اس سے بڑھکر کوئی نعمت نہیں ہے، ایمان کی سادہ حالت بھی نعمت سے کم نہیں، لیکن ایمان کی بہتر اور معیاری حالت جس سے دل ایمان ویقین سے سرشار ہو جائے، ضروری ہے، اس لئے کہ اسلام کے سارے تقاضے ایمان کی اس حالت سے ہی پورے ہو سکتے ہیں۔

قرآن سے فیض رسانی کے لئے
دل کا متوجہ ہونا ناگزیر ہے

وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ. (سورۃ الحاقۃ آیت ۴۸) (اور یہ (کتاب) پرہیزگاروں کے لئے نصیحت ہے)۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ . (سورۃ ق آیت ۳۷) (اس قرآن میں نصیحت ہے اس شخص کے لئے جو دل بینا رکھتا ہو یا جو دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے)۔

سورہ بقرہ کی ابتدائی آیت کے بعد ان دونوں آیتوں میں بھی فرمایا گیا کہ قرآن سے حقیقی نصیحت انہی کو ملے گی جو یا تو نصیحت کی حقیقی طلب رکھتے ہوں یا جن کا دل زندہ اور بینا ہو یا جو دل سے متوجہ ہو کر قرآن کو پڑھتے اور اس کو سنتے ہیں۔

قرآن جیسی مقدس کتاب سے فیض حاصل کرنے کے لئے دل کا متوجہ ہونا ضروری ہے، تاکہ ان آیتوں کی تلاوت سے اللہ کی خشیت پیدا ہو اور دل میں ان آیتوں کے پوری طرح اثرات پیدا ہوں۔

موجودہ دجالی تہذیب کے غلبے کے دور میں جب کہ دل اور ذہن مادیت سے مسحور ہیں، قرآن کی طرف میلان نہ ہونے کے برابر ہے، ایسے دور میں قرآن سے جس طرح کا بھی تعلق قائم ہو، وہ غنیمت ہے، اس سے انشاءاللہ دینی اعتبار سے نفع ہی حاصل ہوگا، البتہ قرآن سے حقیقی فائدہ جس سے ایمان کے ارتقا کے مراحل طے ہوں، اس کے لئے ضروری ہے کہ پوری توجہ، یکسوئی اور دل کی حضوری سے قرآن کو پڑھا جائے اور اس پر غور و فکر کیا جائے اور اپنی تقویٰ کی حالت کو بہتر سے بہتر بنانے کے ارادے سے قرآن سے تعلق رکھا جائے۔

بندہ مؤمن کے لئے دستور العمل

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (سورۃ الانعام آیت ۱۶۲)(آپ فرمایئے بیشک میری نماز میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا اللہ کے لئے ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے) اس چھوٹی سی آیت میں بندہ مؤمن کا دستور العمل بیان ہو گیا ہے کہ اس کی نماز، اس کی قربانی، اس کی زندگی اور موت سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے، یعنی بندہ مومن اپنی زندگی کے جو خطوط بنا چکا ہوتا ہے، اس میں غیر اللہ کے لئے کوئی گنجائش موجود نہیں ہوتی، اس کی پوری زندگی اللہ کی عبادت اور اس کی اطاعت سے وابستہ ہوتی ہے، وہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا سے بے نیاز ہوتا ہے، وہ بظاہر معاملاتِ زندگی سرانجام دے رہا ہوتا

ہے، لیکن اس کا دل متوجہ الی اللہ ہوتا ہے، اس پر ایک ہی کھٹکہ غالب ہوتا ہے کہ اسے اللہ کے سامنے پیش ہو کر، زندگی کا حساب دینا ہے، اللہ کے سامنے پیش ہونے کی فکر مندی اس کا احاطہ کر لیتی ہے۔

بندہ مومن کی ذہنی اور عملی زندگی کا یہ سانچہ ایسا ہے، جو اسے دوسری طرف دیکھنے ہی نہیں دیتا، یہ سانچہ دراصل عبادت اور ذکر و فکر ہی سے بنتا ہے کہ وہ اللہ کے لئے یکسو ہو جاتا ہے، اللہ سے محبت کا مقصد اسے اتنا عزیز ہوتا ہے کہ وہ اس مقصد کی خاطر ساری چیزوں سے دستبردار ہو جاتا ہے، دنیا کی زیادہ ہوس سے وہ محفوظ ہوتا ہے، غیر ضروری کاموں میں مصروفیت سے اس کی طبعی مناسبت نہیں ہوتی، زیادہ باتوں سے اس کی مانوسیت ختم ہو جاتی ہے، اس طرح وہ خالص اللہ کا ہو کر زندگی گزارنے لگتا ہے، یہ مختصر آیت بندہ مؤمن کے ان حالات کی پوری طرح عکاسی کرتی ہے۔

بندہ مؤمن کے جو حالات بیان کیئے ہیں، اللہ ہم سب کو اس طرح کی زندگی عطا فرمائے۔

صادقین کی صحبت کی اہمیت

اور جدید انسان کی حالت زار

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۔ (سورۃ التوبہ آیت ۱۱۹)(اے ایمان والو اللہ سے ڈرتے رہو اور راستبازوں کی صحبت اختیار کرو)۔

اس آیت میں صادقین کی صحبت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے، صادقین (راستباز) وہ لوگ ہوتے ہیں جو قول و عمل کے تضاد سے محفوظ ہوتے ہیں، جو ذکر و فکر کے مجاہدوں سے نفس کو بڑی حد تک سنوار کر چھوٹے پن اور عاجزی کے مقام پر فائز ہوتے ہیں، جو دنیا کی زیب و زینت اور سامان دنیا سے بے نیاز ہوتے ہیں، وہ اپنی طرز زندگی کے ذریعہ یہ پیام دیتے ہیں کہ یہ دنیا

اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس سے محبت کی جائے، اور اپنی ساری توانائیاں اس میں صرف کی جائیں، گزارے کی حد تک دنیا کے لئے جدوجہد کرنے کے بعد باقی وقت یاد اللہ میں صرف کیا جائے، اس سے شخصیت، حرص وہوس اور دنیا کی بہتات کے مرض سے بھی بچ جائے گی، سکون وسکینت اور خوشی وحلاوت سے بھی بہرہ ور ہوگی، ان صادقین کی صحبت سے فرد، اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہونے لگتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان کی صحبت سے دل کی نئی زندگی سے آشنائی ہونے لگتی ہے اور دل، رفتہ رفتہ اللہ کے ذکر کے ذریعہ سے آباد، منور اور شاداب ہونے لگتا ہے، دل کی یہ نئی دنیا، جو ان کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے، وہ ایسی ہوتی ہے کہ فرد، مادی دنیا کو آسانی سے قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، اس لئے کہ مادی راحت کے ساز وسامان اور مادی دنیا میں وہ راحت کہاں، جو دل کو اللہ والوں اور اللہ کے ذکر کے ذریعہ شاداب اور منور کرنے کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صادقین (اللہ والوں) کی صحبت ایک بڑی نعمت ہے، اس سے دل کی ویران دنیا آباد ہونے لگتی ہے، روح، جو محبوب حقیقی کے لئے پیاسی ہوتی ہے، اس کی پیاس کی تسکین کی صورت پیدا ہونے لگتی ہے، فرد کی شخصیت میں عزیز واقارب اور دوست واحباب کے لئے ایثار اور قربانی کا مادہ پیدا ہونے لگتا ہے، جب اللہ کی محبت، اللہ والوں کی صحبت اور ان کی مجلسوں میں شرکت سے حاصل ہونے لگتی ہے تو فرد سراپا حیرت بن جاتا ہے کہ اس دنیا میں اس طرح کی تابناک اور خوشیوں وحلاوتوں سے سرشار زندگی بھی حاصل ہو سکتی ہے، نیز وہ اللہ والوں کی صحبت سے محرومی کی وجہ سے اب تک جس فکری انتشار، اداسی، غم زدگی کی نفسیات اور نفس کے ماحول سے جڑا ہوا تھا، یہ ماحول تو اس کے لئے تباہی کا پیشہ خیمہ تھا، اللہ نے اس پر فضل خاص کر کے اسے اللہ والوں کی مجلس تک پہنچایا، یہ تو اس کے لئے سب سے بڑی خوش بختی ہے۔

بد نصیبی سے موجودہ دور میں کسی بزرگ کی سرپرستی قبول کرنے، اس کی صحبت کے زیر اثر زندگی گزارنے کے کام کی نہ صرف اہمیت نہیں ہے، بلکہ اس کی نفی کی روش غالب ہے، سبب یہ ہے کہ ہر فرد جس کا جدیدیت اور میڈیا سے تھوڑا بہت بھی تعلق ہے، اس میں نہ چاہتے ہوئے بھی بڑے پن کی نفسیات کے اثرات اور اس کے اجزا آجاتے ہیں، وہ اپنے آپ ہی کو سب کچھ سمجھنے لگتا ہے، وہ زیادہ سے زیادہ کتابی علم اور ذہانت سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے، اللہ والے جنہوں نے اپنے آپ کو پامال کر کے غیر معمولی روحانی صلاحیتیں حاصل کی ہوتی ہیں، جدید انسان سرے سے ان سے روحانی اجزاء حاصل کرنے کا شعور وادراک ہی سلب ہو گیا ہے، اس کی جو سزا جدید انسان بھگت رہا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے دوراہے پر حیران وپریشان کھڑا ہے، ذہنی دباؤ، ڈپریشن، شدید فکری انتشار، اداسی، زندگی سے بیزاری، اپنوں اور غیروں سب سے بدظنی کا احساس، بے گانگی وغیرہ یہ ساری چیزیں صادقین کی صحبت سے محرومی ہی کا نتیجہ ہیں، جدید انسان اگر اپنے آپ کو جدیدیت کے مذکورہ امراض اور باطن کی ویرانی سے بچانا چاہتا ہے تو اسے دانشمندی سے کام لے کر صادقین کی صحبت کے ماحول سے جڑنا پڑے گا، امت میں اب تک دل کی ویران دنیا کو آباد کرنے اور روحانیت کے اجزاء حاصل کر کے، روح کو طاقتور بنا کر پوری شخصیت کو مستحکم کرنے کا جو طریقہ رائج رہا ہے، جس پر صدیوں سے ہمارے آباد واجداد قائم رہے، وہ صادقین کی صحبت ہی کا طریقہ رہا ہے۔

جدیدیت کی طوفانی لہروں سے متاثر ہو کر ہم نے اپنے اسلاف کے ورثے سے منقطع ہو کر اس کی بہت بڑی سزا بھگتی ہے کہ فکری انتشار اور ایک دوسرے سے ان بن کے مزاج نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا، اب ہمیں جدیدیت سے آزاد ہو کر، اپنے بزرگوں کے طریقے پر صادقین کے ساتھ تعلق استوار کرنا پڑے گا، اس سے ہمارے لئے دین ودنیا کی راہیں آسان ہوں گی۔

اللہ کے رسول کی اطاعت ایمان کا حصہ ہونا

قرآن نے اللہ کی اطاعت کے ساتھ اللہ کے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت پر زور دیا ہے، قرآن میں بار بار **اَطِیْعُوا اللهَ وَ اَطِیْعُوا وَالرَّسُوْلَ** آیا ہے، اللہ کے رسول کی اطاعت کی اہمیت اس لئے ہے کہ انسان کو زندگی گزارنے کے لئے اللہ نے اس کے لئے جو دستور العمل متعین فرمایا ہے، وہ انبیاء کرام کے ذریعہ بھیجا ہے۔

رسول اللہ ﷺ، انبیاء کی آخری کڑی ہیں، آپ کے ذریعہ اللہ نے دین کی تکمیل فرما دی ہے۔**الیوم اکملت لکم دینکم ۔**

اب جسے بھی اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنی ہے، اسے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرنی ہوگی، اس کے بغیر نہ تو ایمان قابل قبول ہے اور نہ ہی نجات کی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔

ہمارے اس دور میں کوشش ہو رہی ہے کہ اسلام کے مکمل نظام زندگی اور جہاد جیسی تعلیمات واحکامات سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے وحدت مذاہب کے نظریہ کے لئے فضا ہموار ہو جائے، اس سے دوسرے مذاہب پر تو کوئی اثر نہ پڑے گا، کیونکہ ان مذاہب کی بنیادی تعلیمات مسخ ہونے کی وجہ سے وہ محض پوجا پاٹ تک محدود ہیں، جب کہ اسلام کی مکمل تعلیمات جو قرآن وسنت میں محفوظ ہیں، وحدت مذاہب کے ذریعہ رسالت کے عقیدے کو نکال کر بعض اہم سچائیوں کی بنیاد پر جمع ہونے کی دعوت دی جارہی ہے، اس میں بعض عالمی اداروں کا ہاتھ بھی کارفرما ہے، یہ کوشش پہلے بھی ناکام ہوئی ہے، اکبر کے دور حکومت میں، اب بھی ناکام ہوگی، مسلمان، اللہ کے رسول اللہ ﷺ کے بغیر اپنے ایمان کو لاحاصل سمجھتے ہیں۔

اسلام کو مطلوب انسان

اللہ کے آگے سر تسلیم خم کرنا

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ۔(سورۃالنساء آیت ۱۲۵) (اس شخص سے بڑھکر اور کس کا طریقہ زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر لیااور وہ نیکوکار بھی ہے اور جس نے یکسو ہو کر ابراہیم کی پیروی کی)۔

اسلام کو جو انسان مطلوب ہے، اس آیت میں اس کی پوری نشاندہی فرمائی گئی ہے کہ یہ وہ فرد ہے جو اللہ کے سامنے پوری طرح سر تسلیم خم کر دے، جو اللہ کی عبادت واطاعت کا مکمل نمونہ ہو، جو اللہ کے لئے اپنے آپ کو مٹادے اور جس کی زندگی کا کوئی پہلو اور گوشہ ایسا نہ ہو، جو اطاعت سے خالی ہو، جو اسلام کے سارے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہے، جو اللہ کے لئے یکسو ہو جائے۔

اس آیت میں اس فرد کو مثالی حیثیت سے پیش فرمایا گیا ہے کہ اس سے بہتر اور کس کا طریقہ زندگی ہو سکتا ہے، ایسا شخص ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے راستے پر گامزن ہے، جو اللہ کے لئے مکمل طور پر یکسو ہو گئے تھے۔

اسلام کو مطلوب اس طرح کا انسان بڑی مشکل سے تیار ہوتا ہے، اسے نفس پرست اور مادیت پسند معاشرے سے بچ کر چلنا پڑتا ہے۔ اور اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو اللہ کے لئے استعمال کرنا پڑتا ہے اور اپنی شخصیت کی نشوونما اس طرح کرنی پڑتی ہے کہ اس میں غیر اللہ کے لئے کوئی گنجائش موجود نہ ہو، اس طرح کا انسان ہی پھر داعی الی اللہ بنتا ہے، جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہے، اسے اس مقصد کے لئے ایثار اور قربانیوں کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو گزرنا پڑا، مذکورہ آیت میں اسی کا ذکر ہے، اگرچہ یہ قربانیاں اور ایثار اس کی حیثیت کے مطابق ہوتی ہیں، لیکن ہوتی ضرور ہیں۔

قرآن کا نصیحت کی طلب والوں کے لئے آسان ہونا

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ۔(سورۃ یوسف آیت ۱۰۴)(یہ قرآن اور کچھ نہیں سارے عالم کے لئے نصیحت ہے)۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔(سورۃ القمر آیت ۴۰)(بیشک ہم نے قرآن کو نصیحت پزیری کے لئے آسان کر دیا ہے پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا)۔

قرآن انسانی فطرت سے ہمہ آہنگ کتاب ہے اور انسان کے دل کی آواز ہے، اس لئے وہ نصیحت کے لئے آسان بھی ہے تو سارے عالم کے لئے نصیحت بھی۔

قرآن میں ماضی کی قوموں کے حالات وواقعات کے حوالے سے عبرت وموعظت کا سامان موجود ہے اور انسان کی ابدی زندگی کی تیاری کے لئے اس میں پیام موجود ہے، اس لئے قرآن سراسر نصیحت ہے، لیکن انسان کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ غفلت، بے توجہی اور نفس پرستی کی قوتوں نے لگ بھگ ہر دور میں اس کا اتنا گھیراؤ کیا ہے کہ وہ سرے سے قرآن کا پیام سننے اور قرآن کی آواز کی طرف متوجہ ہونے کے لئے ہی تیار نہیں ہے، جب قرآن کے حوالے سے انسان کی بے توجہی کی یہ حالت ہو تو قرآن سے نصیحت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے اور قرآن تذکیر وہدایت کا ذریعہ کس طرح ہو سکتا ہے، طلب اور ذوق کے بغیر تو سوائے محرومی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

قرآن کا نصیحت کے لئے آسان ہونا حقیقت ہے، لیکن اس کے لئے طلب اور آمادگی کا ہونا ضروری ہے، دوسری صورت میں یعنی افراد کے نہ چاہتے ہوئے یہ نصیحت ان پر مسلط نہیں کی جاتی۔

طلب کی شرط یہ ہے کہ قرآن سے مستقل تعلق قائم ہو، روزانہ غور وفکر سے اس کی تلاوت ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات پر ہر ممکن حد تک عمل پیرا ہونے کی

کوشش ہو، طلب کی خاصیت یہ ہے کہ جب تک قابل ذکر حد تک اپنی اصلاح نہ ہو، تب تک دوسروں کو قرآن سنانے کا کام ہدف نہ ہو۔

اللہ کی طرف بلانے والی بات کا سب سے بہتر ہونا

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللهِ وَعَمِلَ صَالِحًا (سورۃ حٰمٓ السجدہ آیت ۳۳) (اور اس شخص سے بڑھکر بات کس کی بہتر ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور اچھے اعمال کرتا رہے)۔

حقیقی داعی ہمیشہ لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتے رہے ہیں کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کی اطاعت کے ذریعے بندگی کے فرائض بجالائیں، دعوت کا یہ کام حقیقی داعیوں کو سب سے زیادہ عزیز رہا ہے، ساتھ ساتھ وہ لوگوں کو جس کام کی دعوت دیتے رہے ہیں، وہ خود بھی اس پر عامل رہتے ہیں، ایمان، اخلاص، اعمال، اللہ سے تعلق کا استحکام، ان کی اپنی زندگی بھی اس کا نمونہ ہوتی ہے تو وہ دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتے ہیں۔

اس طرح کے داعیوں کی بات (یعنی ان کے دعوت کے کام) کو سب سے بہتر بات فرمائی گئی ہے، ایسے افراد معاشرے کے سب سے بہتر افراد شمار ہوتے ہیں، اللہ کے ہاں اخلاص سے سرانجام دینے والے ان کے ان کاموں کو قبولیت کا شرف حاصل ہوتا ہے، اس کام کی مستقلا توفیق کا عطا ہونا خود شرف قبولیت حاصل ہونے کی علامت ہے۔

طاغوت کی عبادت سے بچنے کی تاکید

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ۔ (سورۃ النحل آیت ۳۶) (اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور طاغوت (غیر اللہ) کی پرستش سے اجتناب کرو)۔

اللہ کی عبادت کی دعوت دینا یہ انبیاء کرام کا مقصود رہا ہے، یا قوم العبد اللہ، ہر نبی نے اپنی قوم کو یہی دعوت دی ہے کہ غیر اللہ کی پرستش سے توبہ تائب ہو کر اللہ واحد کو حقیقی معبود بنا لیں، لیکن چونکہ اکثر قوموں کے مزاج، ذہن اور نفسیات کی تشکیل طاغوت کی عبادت کی بنیادوں پر متشکل ہوئی تھیں، اس لئے وہ اللہ کی عبادت کی طرف آنے کے لئے تیار نہیں ہوئی، چونکہ انبیاء کے ذریعہ اتمام حجت ہو جاتی ہے، اس لئے پھر قوموں کو اس سرکشی کی دنیا میں بھی سزا دی گئی۔

طاغوت کی پرستش میں بتوں کی پرستش، اپنے زمانے کے وفات شدہ بزرگوں کی پرستش، شیطان کی پرستش اور نفس وغیرہ کی پرستش سب شامل ہیں، موجودہ دور کا سب سے بڑا طاغوت جس کی سب سے زیادہ پرستش ہو رہی ہے، وہ مادیت کا بت ہے، اس بت کو اس طرح سجا کر پیش کیا جا رہا ہے کہ اس کی پرستش کا میلان بڑھتا ہی جا رہا ہے، مسلم امت کو بھی سب سے بڑا چیلنج اس طاغوت کی طرف سے ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس طاغوت کے ہمہ گیر اثرات سے مکمل طور پر بچالے اور خالص اپنی عبادت کی راہ پر گامزن فرمائے۔

غلبہ اسلام کے لئے

ریاستی قوت کی ضرورت

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (سورۃ الحدید آیت ۲۵) (اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان پر کتابیں نازل کیں اور میزان (عدل) تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے پیدا کیا ہے لوہے کو اس میں بڑی قوت ہے اور طرح طرح کے فائدے ہیں)۔

اس آیت میں لوہے کا ذکر کرنا کہ لوہے کو پیدا کیا، جس میں بڑی قوت ہے، اس سے مقصود اس قوت کے ذریعہ عدل وانصاف قائم کرنا اور اسلامی شریعت کے قوانین کو نافذ کرنا، فتنہ پرور قوتوں کی سرکوبی اور اہل باطل کو زیر نگین کرنا اور اسلام کی برتری کے لئے حالات سازگار بنانا ہے، اس آیت سے غلبہ اسلام کے لئے لوہے کی قوت کو استعمال کرنے کی تائید وتاکید ہوتی ہے۔

موجودہ دور میں اسلام کی مظلومیت کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اسلام کا نفاذ چاہنے والے ریاست کی قوت سے محروم ہیں، عالمی طاغوت نے ہر مسلمان ملک میں ایسے حالات پیدا کردیئے ہیں کہ حکومت سیکولر طبقات کے ہاتھوں میں رہے، تاکہ مسلمان ممالک سے وابستہ ان کے مفادات کی تکمیل ہوتی رہے۔

ریاستی قوت بگاڑ کا بھی بہت بڑا ذریعہ بنتی ہے تو اصلاح وسدھارنے کا بھی۔ جب تک ریاستی قوت اسلام کے ہمنوا نہ ہوگی، مسلم ملت کے حالات میں بہتری کی صورت پیدا نہ ہوسکے گی، اس لئے کہ ریاست اپنے سارے اداروں کو سیکولر مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہے، جس سے دوسرے نقصانات کے علاوہ اسلام کا دعوتی اور اصلاح کا کام کرنے والے افراد اور اداروں کی راہیں بھی مسدود ہوجاتی ہیں۔

مسلمان ممالک میں غلبہ اسلام کے لئے جو کام ہورہا ہے، ہمیں اس کام کی تقویت کا ذریعہ بننا چاہئے۔

اسلام کے بہت سارے کام غلبہ اسلام ہی سے وابستہ ہیں، اس لئے اس کام کو معمولی کام نہیں سمجھنا چاہئے، لیکن غلبہ اسلام کا کام کرنے والوں کی اپنی زندگی بھی اسلامی تعلیمات سے ہمہ آہنگ ہونی چاہئے۔

جب زندگی اسلام سے ہمہ آہنگ ہوگی تو غلبہ دین کے کام میں اللہ کی طرف سے مدد کی صورتیں پیدا ہوتی رہیں گی اور تھوڑی سی جدوجہد کے بھی اثرات زیادہ ہوں گے۔

افراد اور قوموں کے لئے بقا کا اصول

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (سورۃ الرعد آیت ۱۷)(جھاگ تو رائیگاں چلا جاتا ہے جو چیز لوگوں کے لئے نفع بخش ہوتی ہے، وہ باقی رہتی ہے زمین میں)۔

اس آیت سے ایک اہم بات جو معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ جس علم، ذہانت، دولت اور شخصیت سے لوگوں کو نفع حاصل نہیں ہوتا، اس کی حیثیت جھاگ کی سی ہوتی ہے، جو بظاہر تو بڑی نظر آتی ہے، لیکن وہ شور کرتے ہوئے فنا ہو جاتی ہے، اللہ کا یہ اصول ہے کہ نافع شخصیت اور نافع قوم ہی کو بقا حاصل ہوتی ہے اور وہ مٹ جانے سے محفوظ ہوتی ہے۔

اس وقت ہماری سیاست، ہمارے علوم اور ہماری مقتدر شخصیتوں میں نفع بخش اجزاء کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ قوم وملت بُرے حشر سے دوچار ہے، ہماری مذہبی زندگی میں بھی اس جوش وخروش اور اس ذوق وشوق کی کمی ہے، جس سے ملت میں روح پھونکی جاسکے اور اسے دینی اعتبار سے توانا بنایا جاسکے۔

جب فکری اور علمی جمود پیدا ہوتا ہے، مفادات کی نفسیات غالب ہوتی ہے تو سمجھنا چاہئے کہ اس طرح کی قوم جھاگ کے مثل ہوتی ہے، جو فنا ہونے کی علامت ہے۔

مزید کہا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ بقا کا استحقاق لوگوں کو نفع پہنچانے سے وابستہ ہے، یہ نفع علم کے ذریعے سے ہو، سیاست کے ذریعے ہو یا کسی بھی طریقے سے ہو، ایسے افراد اور ایسے طبقات کو بقا حاصل ہوتی ہے، جب علم، سیاست، دولت اور ذہانت وغیرہ ذاتی اغراض

ومفادات کے تابع ہو جائے تو پھر قدرت کے قانون کے مطابق اس طرح کے طبقات کی مثال جھاگ کی سی بن جاتی ہے۔

لوگوں کے لئے نافع بننے کے لئے ضروری ہے کہ معاشرے کے مؤثر طبقات اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کریں، اس کی صورت یہ ہے کہ علمی اور ذہنی صلاحیتوں کو فروغ دے کر قوم کی صحیح خطوط پر رہنمائی ہو، سیاست کا قوم کی فلاح و بہبود کے مقصد کے لئے استعمال ہو، سماجی خدمت کے ادارے مستحکم کر کے بے سہارا افراد کو سہارا دینے کی صورت پیدا ہو، حکومتی پالیسیاں قوم کی بہتری کے لئے تشکیل ہوں، مذہبی قیادت کا اپنے دور کے چیلنج کو سمجھکر فکری رہنمائی ہو، روحانی قیادت کی طرف سے افراد کی اصلاح و تربیت کے لئے دل سوزی اور سلف کے طریقے پر کام ہو۔

جب ایسا ہو گا تو اس طرح کی ملت زندگی کے استحقاق کا ثبوت دیتی ہے، اور قدرت کا قانون حرکت میں آکر اس طرح کی ملت کو عروج کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔

مولانا زاہد الراشدی

گلوبل سوسائٹی میں
دینی تعلیم کے نئے تقاضے

اس وقت کے عمومی حالات کے پیش نظر دینی تعلیم کے معروضی تقاضوں کے حوالے سے جو ضروریات محسوس کی جا رہی ہیں، ان کا ایک ہلکا سا خاکہ آپ حضرات کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اس خیال سے کہ دینی تعلیم کے نظام سے عملی طور پر وابستہ حضرات ان پر غور فرمائیں اور انہیں اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں کسی نہ کسی جگہ ایڈجسٹ کرنے کی عملی صورتیں تلاش کریں، کیونکہ ان ضروریات کو محسوس کرنا، اور انہیں پورا کرنے کی عملی شکلیں تلاش کرنا بہر حال ہماری ہی ذمہ داری بنتی ہے۔ ان میں سے بیشتر ضروریات ایسی ہیں جن کی طرف اکابر علماء دیوبند نے بھی اپنے اپنے دور میں اور اپنے اپنے انداز میں توجہ دلائی ہے، اور ان ضروریات کی تکمیل کی راہ ہموار کرنے کی ہمیں وقتاً فوقتاً تلقین فرمائی ہے۔ مثلاً:

غیر مسلموں تک دین کی دعوت اور اسلام کا تعارف پہنچانے کی ذمہ داری ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اور اس میں ان مسلمانوں اور خاص طور پر علماء کرام اور دینی مدارس و مراکز کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے، جو غیر مسلم اکثریت کے ممالک میں رہتے ہیں کہ وہ اپنے ارد گرد رہنے والے غیر مسلموں کو اسلام سے متعارف کرائیں۔ جناب نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی اور تعلیمات کی پہچان کرائیں، اور اسلام قبول کرنے کی دعوت دیں۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ وہ جس سال دار العلوم دیوبند میں حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری سے بخاری شریف پڑھ کر دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے تو حضرت شاہ صاحب نے فارغ التحصیل ہونے والے علماء کرام سے

فرمایا کہ : دنیا تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے انگریزی زبان سیکھنا ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر باقی دنیا کے ساتھ اسلام کی بات کرنا آج کے زمانے میں مشکل ہے۔

دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کی تعلیم ضروری ہونے کی بات سب سے پہلے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے اس دور کی، جب وہ ابھی دار العلوم دیوبند میں صدارت تدریس کی ذمہ داری کے لیے تشریف نہیں لائے تھے، اور سہلٹ (بنگلہ دیش) میں قیام پذیر تھے۔ انہوں نے اس دور میں آسام کے دینی مدارس کے لیے ابتدائی تعلیم سے لے کر دورۂ حدیث تک پورے اٹھارہ سال کا تعلیمی نصاب مرتب کیا، جو شائع شدہ موجود ہے۔ اور اس میں دینی علوم کے ساتھ ضروری عصری علوم مثلاً سائنس، ریاضی، انگلش، معاشرتی علوم اور ٹیکنالوجی وغیرہ کو نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ مگر حضرت مدنی کے دار العلوم دیوبند تشریف لے جانے کی وجہ سے آسام میں انہیں اس تجربہ کا موقع نہ مل سکا، البتہ ان کا مرتب کردہ یہ مشترکہ نصاب آج بھی مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔

امت کو عمومی طور پر دین کی طرف واپس لانے کی جدوجہد کا آغاز حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی نے کیا، جو آج پوری دنیا میں پھیل رہی ہے۔ دین کے اعمال اور ماحول کی طرف دنیا بھر کے مسلمانوں کی واپسی کی اس جدوجہد میں شرکت اور اسے صحیح سمت آگے بڑھانے کے لیے رہنمائی کا کام بھی علماء کرام اور دینی مدارس کی ذمہ داریوں کے دائرے سے باہر نہیں ہے، اور ہم سب کو اس ضرورت کا احساس کرنا چاہیے۔

فقہاء کرام نے دین کی تعلیم کے دو درجے بیان کیے ہیں: فرض عین اور فرض کفایہ۔ فرض کفایہ کے دائرے میں تو دینی مدارس بہت اہم کردار ادا کر رہے ہیں کہ امت کو علماء کرام، ائمہ، خطباء، مدرسین، حفاظ، قراء، مفتیانِ کرام اور مبلغین تیار کر کے دے رہے ہیں۔ مگر فرض عین کے دائرے میں، کہ ہر مسلمان مرد اور عورت دین کی ضروریات سے بہر صورت آگاہ ہو، اس کے لیے ہمارا کوئی منظم اور مربوط کام موجود نہیں ہے۔

حضرت مولانا سید احمد رضا بجنوری نے ملفوظات علامہ انور شاہ کشمیری میں ذکر کیا ہے کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے لکھا ہے کہ ماضی کے فقہاء کرام نے صرف دیارِ اسلام کے مسائل لکھے ہیں، اور دیارِ کفر کے نہیں لکھے۔ اس لیے اب ہمیں پریشانی ہوتی ہے۔ شاید وہ سمجھتے ہوں کہ مسلمانوں کو دیارِ کفر میں رہنا ہی نہ پڑے گا۔ اب ضرورت ہے کہ دیار کفر کے لیے جو اسلامی احکام ہیں، وہ بھی مدون کر دیے جائیں، کیونکہ اسلامی احکام میں بڑا توسع ہے۔ اس میں جہاں دیارِ اسلام کے لیے احکام ہیں، دیارِ کفر کے لیے بھی ہیں، خاص طور پر فقہ حنفی میں یہ توسع بہت زیادہ ہے۔ مولانا بجنوری نے اس کے ساتھ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کا یہ ملفوظ بھی نقل کیا ہے کہ ایسے ہی فقہاء نے صرف قضا کے مسائل لکھے ہیں، اور دیانت کے مسائل سے صرف نظر کر لی ہے، یہ بھی بڑی کوتاہی ہوئی ہے جس پر آج کے فقہاء کرام کو کام کرنا چاہیے۔

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی نے حیات مفتی اعظم میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ دار العلوم دیوبند کے نصاب میں قدیم فلسفہ رائج تھا، جدید فلسفہ شامل نصاب نہ تھا۔ استاذِ محترم حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری نے درس حدیث کے دوران کئی طلبہ سے فرمایا کہ پہلے زمانے میں ہمارے اسلاف نے قدیم فلسفہ پڑھ کر اس کا رد کیا کہ اس وقت وہی رائج تھا، لیکن آج کل قدیم کی جگہ جدید فلسفے نے لے لی ہے، اب دنیا میں یہی فلسفہ رائج ہے، اس لیے جدید فلسفہ ضرور پڑھنا چاہیے تاکہ نئے فتنوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔

حضرت شاہ صاحب کے اس ارشاد گرامی کی وضاحت میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ہمارے علم عقائد وکلام کے اکثر مباحث معتزلہ وغیرہ کے ساتھ یونانی فلسفے کے مسائل کے حوالے سے ہیں۔ اپنے ماضی کے علمی ورثہ اور اعتقادی نظام کے ساتھ وابستگی کے لیے ان کی تعلیم ضروری ہے، لیکن آج کے دور میں یونانی فلسفہ متروک ہو چکا ہے۔ اس کی جگہ مغرب

کے جدید فلسفے نے لے لی ہے جو انسانی حقوق اور آزادی کا فلسفہ کہلاتا ہے۔ اور آج کے اعتقادی اور فکری مباحث زیادہ تر اسی فلسفے کے پیدا کردہ ہیں۔ اس لیے مغربی فلسفے کی تعلیم کو دینی تعلیم کے نصاب میں شامل کرنا بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح یونانی فلسفہ کو شامل کرنا ضروری تھا۔ پرانے دور میں ہمیں معتزلہ کی عقلیات کا سامنا تھا، لیکن آج کے دور میں ہمیں سیکولر اور حقوق پرست حلقوں کی عقلیات سے سابقہ درپیش ہے، جس کا مقابلہ کرنے کے لیے سیکولر فلسفہ اور ہیومنیٹی کے جدید نظام کو سمجھنا، اور اس پر عبور حاصل کرنا ہماری ذمہ داری ہے، تاکہ اسے اسی کی زبان میں رد کیا جا سکے۔ میری طالبعلمانہ رائے میں تفتازانی کی شرح العقائد کی دوسری جلد لکھ کر اسے نصاب میں شامل کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

مغربی فلسفے کے اسکالرز کی طرف سے اسلامی احکام وتعلیمات پر جو علمی اور فکری اعتراضات پیش کیے جارہے ہیں ان کی طرف سنجیدہ توجہ اور منظم محنت کی ضرورت ہے، کیونکہ نئی نسل کے فکری ارتداد کا بڑا سبب یہی اشکالات واعتراضات بن رہے ہیں، جبکہ کوئی معقول جواب نہ ملنے کے باعث یہ اعتراضات ان کے ذہنوں میں پختہ ہوتے جارہے ہیں۔

تشکیک آج کے دور کا سب سے بڑا فتنہ ہے، اور نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اکثریت اس کا شکار ہے۔ یہ فکری ارتداد ہے جس کے بارے میں حضرت علامہ سید ابوالحسن علی ندوی نے **ردة ولا ابا بكر لها** کے عنوان سے کتابچہ لکھ کر اس کی طرف توجہ دلائی تھی۔ یہ فکری ارتداد دن بدن بڑھتا جارہا ہے۔ اس کی بنیاد علم کی کمی اور معلومات کی وسعت پر ہے۔ معلومات کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جارہا ہے، جبکہ علم کا دائرہ سمٹ رہا ہے۔ اس کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے، اس کے اسباب معلوم کرنے اور نئی نسل کو اس سلسلے میں علمی وفکری رہنمائی مہیا کرنے کے مربوط نظام کی ضرورت ہے، مگر ہمارے دینی مدارس ومراکز اس پر سنجیدگی کے ساتھ توجہ نہیں دے رہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے اس کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے کہ متکلمین نے جو علم کلام مدون کیا ہے اس میں سب کچھ موجود ہے، کیونکہ انہی کے مقرر کردہ اصولوں پر سارے شبہات کا جواب بھی دیا جا سکتا ہے اور اسی (قدیم) ذخیرے سے علم کلام جدید کی بھی باآسانی تدوین ہو سکتی ہے۔ میں نے بطور خود ہی بعض شبہات جن کا مجھے علم تھا، جواب لکھ کر **الانتباهات المفيده عن الاشتباهات الجديدة** کے نام سے شائع کر دیا ہے، اور اس میں ایسے اصول موضوع قائم کر دیے ہیں جن سے میرے نزدیک اس قسم کے جتنے شبہات بھی ہوں، بسہولت رفع کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن حضرت تھانوی یہ بھی اس کے ساتھ فرماتے ہیں کہ اب مجھ میں قوت کہاں، کام کے لوگ موجود مگر کام نہ کریں تو اس کا کیا علاج ہے۔ آرام طلبی سے کام نہیں ہوتا، کام تو کرنے سے ہوتا ہے، مجھ سے برا بھلا جیسا ہو سکا دین کی ضروری خدمات کر چکا، اب جو اور کام باقی ہے اس کو اور لوگ کریں، کیا وہ نہیں کر سکتے؟ مجھ سے اچھا کر سکتے ہیں، لیکن اگر خوامخواہ واجد علی شاہ بن جائیں تو اس کا علاج ہی نہیں ہے۔

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ حضرت تھانوی علم کلام کے قدیم ذخیرے میں ساری باتیں موجود ہونے کے باوجود جدید علم کلام کی تدوین کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں، اس کا انہوں نے آغاز بھی کر دیا تھا۔ لیکن ان کا شکوہ ہے کہ کام کو آگے بڑھانے کے لیے جو کچھ ہونا چاہیے وہ نہیں ہو رہا، اور جو لوگ کر سکتے ہیں وہ آرام طلبی کا شکار ہیں۔

حضرت تھانوی کا ایک اور شکوہ بھی ملاحظہ کر لیجیے! وہ فرماتے ہیں کہ یہ میری بہت پرانی رائے ہے، اور اب تو رائے دینے سے بھی طبیعت افسردہ ہو گئی ہے، اس لیے کہ کوئی عمل نہیں کرتا، وہ یہ ہے کہ تعزیرات ہند کے قوانین اور ڈاکخانہ اور ریلوے کے قواعد بھی مدارس اسلامیہ کے نصاب میں داخل ہونے چاہیں، یہ بہت پرانی رائے ہے مگر کوئی نہیں مانتا اور نہ سنتا ہے۔

زبانوں کا مسئلہ بھی عجیب سا ہو گیا ہے کہ انگریزی زبان میں معیاری گفتگو اور تحریر کی بات تو رہی ایک طرف، بعض اداروں کے استثناء کے ساتھ ہمارے بیشتر مدارس میں عربی زبان میں خطابت اور مضمون نویسی کی مشق کا کوئی نظم موجود نہیں ہے۔ ان کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے اکثر فضلاء عربی زبان میں باہمی گفتگو، کہیں بیان کرنے یا کوئی معیاری مضمون تحریر کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، حتیٰ کہ اردو میں بھی معیاری گفتگو، خطابت اور تحریر کا مطلوبہ مؤثر معیار ہمارے حلقوں میں نہیں پایا جاتا۔ میں اسے اضعف الایمان کا درجہ قرار دیتا ہوں کہ ہمارا فارغ التحصیل کم از کم اردو میں ہی پڑھے لکھے لوگوں کے حلقے میں سلیقے سے گفتگو کر سکے، یا آج کی صحافتی زبان میں ڈھنگ کا کوئی مضمون لکھ سکے۔ جبکہ آج کے ابلاغ عامہ اور میڈیا کا معیار بہت مختلف ہے۔ اس طرح میڈیا اور صحافت کی زبان، اسلوب، تکنیک، اور معیار تک سرے سے ہماری رسائی نہیں ہے۔

غیر مسلم اکثریت رکھنے والے ممالک میں رہائش پذیر مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں احکام و قوانین کی تدوین کی بات حکیم الامت حضرت تھانوی کے حوالے سے سطور بالا میں گزر چکی ہے، جبکہ میری طالبعلمانہ رائے میں ایک اور اہم مسئلہ ہماری فوری توجہ کا مستحق ہے کہ جس مسلم معاشرے میں احناف کی اکثریت ہے، وہاں کے عمومی احکام و قوانین یقیناً فقہ حنفی کی بنیاد پر طے ہوں گے اور ہو رہے ہیں۔ اسی طرح شوافع، مالکیہ، حنابلہ اور ظواہر کی اکثریت رکھنے والے ممالک میں انہی فقہوں کو تفوق حاصل ہے۔ لیکن دنیا کے بہت سے علاقوں میں مشترک سوسائٹیاں وجود میں آ رہی ہیں، بالخصوص مغربی ممالک میں اکثر جگہ صورتحال ہے کہ ایک مسجد میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور سلفی مسلمان اکٹھے نماز پڑھتے ہیں، انتظامیہ میں بھی شریک ہیں، ان جگہوں پر مسائل کا حل کن بنیادوں پر ہو گا، اور مشترکہ مسائل کے حل کے لیے مشترکہ فقہی اصول کیا ہوں گے؟

یہ ایک اہم ملی ضرورت ہے جس کی طرف فقہاء کرام اور دینی مدارس و مراکز کو بالآخر متوجہ ہونا پڑے گا۔ یہاں اتنی بات کہہ دینے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا کہ فقہی ذخیرے میں اس سلسلے میں سینکڑوں جزئیات موجود ہیں جن کی بنیاد پر مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔ اس لیے بات اصول اور قوانین کی ہے کہ آج کے عالمی حالات اور مسلم امہ کی مجموعی ضروریات کے پیش نظر ان کی باقاعدہ تشکیل وتدوین کی جائے۔

ہمارے ہاں تخصص فی الفقہ یا تخصص فی الافتاء کے عنوان سے بیسیوں مدارس میں کورسز چل رہے ہیں، لیکن ان کا دائرہ کار عمومی اور ملی ضروریات کے تناظر میں بہت ہی محدود ہے۔ ہمارے اپنے ممالک اور معاشروں کے پس منظر میں مفتی حضرات کی تیاری کے لیے یہ کورسز بہت مفید اور ضروری ہیں اور بہت سے مدارس کے نصاب بہت حد تک معیاری بھی ہیں، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ آج کے گلوبل ماحول اور مشترکہ سوسائٹیوں میں دوسرے فقہوں کے اصول اور طرق استنباط بالخصوص شافعی، مالکی، حنبلی اور ظاہری فقہوں کے اصول و قوانین سے ضروری واقفیت کے بغیر کوئی مفتی اپنی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کر سکتا ہے۔ بلکہ میری طالبعلمانہ رائے یہ ہے کہ تخصص فی الفقہ کے نصاب میں امت کے دائرے کی دیگر فقہوں کے ساتھ ساتھ آج کے قانون سازی کے عالمی اصولوں اور معاشرتی ارتقاء کی بنیادوں سے واقفیت کو بھی شامل کرنے کی ضرورت ہے۔

قدیم دور میں جب ابھی علم کلام باقاعدہ منظم ہو کر سامنے نہیں آیا تھا، اور فقہ کو احکام کے دائرے میں محدود نہیں کر دیا گیا تھا، اس وقت فقہ کی اصطلاح بہت وسیع مفہوم میں استعمال ہوتی تھی۔ اور اس میں فقہ الاحکام کے ساتھ ساتھ فقہ العقائد اور فقہ النفس (اصلاح نفس) بھی فقہ اور تفقہ کا حصہ سمجھی جاتی تھیں۔ خود حضرت امام ابو حنیفہ کا عقائد پر رسالہ الفقہ الاکبر کے نام سے موجود ہے۔ ان میں سے فقہ العقائد تو علم کلام کی صورت میں الگ طور پر مرتب ہو کر نصاب کا حصہ بن گئی، مگر فقہ النفس (تصوف) ہمارے نصاب میں شامل نہیں

رہی اور اسے اختیاری درجے میں ہی رکھا جاتا ہے۔ میری طالبعلمانہ رائے میں اس فقہ کو اپنے قدیمی مفہوم میں تمام شعبہ جات کے ساتھ نصاب کا باضابطہ حصہ ہونا چاہیے اور آج کے حالات میں اس کی ضرورت کا احساس پہلے سے بڑھتا جارہا ہے۔

تعلیم کے ماحول میں آن لائن سسٹم تمام تر تحفظات کے باوجود تیزی کے ساتھ جگہ بنا رہا ہے، اور عموم بلوی کی صورت اختیار کر گیا ہے، اسے نظر انداز کرنا نقصاندہ ہوگا۔ دینی تعلیم کے لیے اس کے مؤثر استعمال کے ذرائع اور مواقع تلاش کرنا، اپنے اساتذہ اور طلبہ کو ان کی ٹریننگ دینا، اور اپنے تعلیمی مقاصد کے لیے ان کا بھرپور استعمال کرنا اب ہماری ضروریات میں شامل ہو چکا ہے، اس طرف بھی سنجیدہ توجہ کی ضرورت ہے۔

دینی تعلیم کی ان ناگزیر ضروریات اور تقاضوں پر دینی مدارس کے اساتذہ کی نظر رہنی چاہیے، ضروری نہیں کہ سب لوگ ان سب کاموں کی طرف متوجہ ہوں، اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ سب ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بیک وقت کوئی مہم چلائی جا سکے۔ لیکن یہ بہر حال ضروری ہے کہ دینی مدارس کے اساتذہ کو آج کی ان معروضی ضروریات کا علم ہو، ان کا احساس ہو، اور ان کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے کا ذوق پیدا ہو جائے۔ سر دست اگر اساتذہ صرف اتنی بات کا اہتمام کر لیں کہ ان ضروریات سے واقفیت حاصل کر لیں، ان کے بارے میں ضروری معلومات کے ساتھ غور وخوض کرتے رہیں، اور دوران تدریس اپنے شاگردوں کو حسب موقع اور حسب ضرورت ان کی طرف توجہ دلاتے ہوئے علمی وفکری رہنمائی فراہم کرنے کو معمول بنالیں تو اس سے بھی اچھی پیشرفت ہو سکتی ہے اور **رب مبلغ اوعیٰ لہ من سامع** کا خوشگوار منظر دیکھنے کو مل سکتا ہے۔

موبائل فون کا استعمال

رحمت یاز حمت

گذشتہ کچھ دہایوں سے دنیا ایک گلوبل ولیج بن چکی ہے، جسکی وجہ سے مسافتی دوریاں تقریباً ختم ہو چکی ہیں۔ان دوریوں کو کم کرنے میں موجودہ ایجادات کا بڑا ہاتھ ہے، ویسے تو ایسی ایجادات کی فہرست طویل ہے مگر ان میں سر فہرست اور نمایاں موبائل فونز کی ایجاد ہے، ابتدائی طور پر تو موبائل فون پرانے فون یعنی(Land line phone) کے متبادل کے طور پر اپنائے گئے، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسمیں جن تبدیلوں (Innovations) کا اضافہ ہوا وہ ہمہ پہلو اور ہمہ جہتی ہیں۔

اس آلے کی ایجاد سے دنیا میں شاید ہی کوئی فرد ہو جو اس سے استفادہ نہ کرتا ہو۔فرد ہو یا معاشرے کی کوئی بھی اکائی مثلاً اس کا استعمال اداروں سے منسلک لوگ بھی کرتے ہیں تو کاروباری دنیا کے لوگ بھی۔درس وتدریس سے منسلک افراد ہوں یا صحافتی حلقہ، مقتدر احباب ہوں یا دھاڑی دار طبقہ، سب کی جیبوں میں موجود ہوتا ہے۔ مگر جب سے اسمارٹ موبائل فون سامنے آیا ہے اس وقت سے دنیا اس میں سمٹ آئی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اس کا استعمال معاشرے میں ہر خاص وعام میں یکساں ہے، مگر اب اسمارٹ فونز کا استعمال صرف روابطہ کو استوار کرنے کے لئے ہی نہیں، بلکہ اس آلے میں (Gadget) تفریح(entertainment) کی ایک وسیع دنیا سمائی ہوئی ہے۔ جس میں سوشل میڈیا کی ایک نہ ختم ہونے والی دنیا ہے۔

دور حاضر کا ہر فرد تقریباً اسکے سحر میں مبتلا ہے ۔ اسکے علاوہ اسمارٹ فونز تجارتی وکاروباری لین دین میں بھی استعمال ہوتا ہے اور کچھ کاروباری معاملات میں اس کا استعمال

ناگزیر ہے۔ کوئی بکنگ کرانی ہو یا بل جمع کروانا ہو۔ روپیوں کی ترسیل ہو یا کوئی معلومات حاصل کرنی ہو، بس اپنا انٹرنیٹ آن کرنے کی دیر ہوتی ہے۔

یہ تو وہ باتیں ہیں، جس سے ہر فرد استفادہ کرتا ہے مگر اس کے استعمال کے منفی پہلو اسکی افادیت پر بھاری ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں: وقت کا ضایع ہونا، یہ اس کا سب سے زیادہ نقصان دہ پہلو ہے اس میں اخلاق باختہ مناظر کی بھرمار ہے، جس سے نظروں کی حفاظت غیر معمولی طور پر متاثر ہوتی ہے۔ اس کے مسلسل استعمال سے انسانی اعضاء خصوصاً ذہن، آنکھیں اور کان بُری طرح متاثر ہوتے ہیں، اس کے زیادہ استعمال سے انسانی شخصیت میں چڑچڑاہٹ۔ بے خوابی۔ اکیلا پن جیسے جسمانی اور دماغی عوارض پیدا ہوتے ہیں۔

چھوٹی عمر کے بچے اس کے استعمال سے بہت ساری پیچیدگیوں کا شکار ہوتے ہیں، مثلاً طبیعت میں ہیجان کا پیدا ہونا، ہم عمر بچوں سے گھلنے ملنے سے گریز کا ہونا وغیرہ۔

مذہبی طبقے کی موبائل (اسمارٹ) فون کے استعمال کے بارے میں رائے بین بین ہے۔ ایک طبقہ اس کے استعمال کی اجازت صرف بات چیت کی حد تک دیتا ہے، اس سے زیادہ کے استعمال کے وہ مخالف ہیں۔

علماء کا دوسرا طبقہ اس کی کسی قدر اجازت دیتا ہے۔ دینی تبلیغ، تعلیم اور تعلم اور جدید لادینی اور سیکولر نظریات اور جدید مادیت پسندی کے رجحانات کے تعاقب کیلیے روایتی ذرائع اور طریقوں کے علاوہ موجودہ اسمارٹ فون اور اس میں موجود میڈیا پلیٹ فارمز کے استعمال کی اجازت دیتا ہے، اس کے دفع میں ان کی دلیل کافی معقول معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ دور میں ہر کس وناکس کے پاس موبائل فون موجود ہے، کیونکہ دنیا کی ساری لادینی، سیکولر اور مادیت پسند قوتیں اپنے نظریات کے فروغ کے لئے اس کا استعمال کر رہی ہیں اور معاشرتی ماہرین اس کی اثر پذیری کے جو اعداد شمار اپنی اپنی تحقیق میں بتاتے ہیں وہ بڑے ہی ہوشربا ہیں۔ انہی

وجوہات کی بناپر طبقہ علماء کا یہ گروہ اس کے مندرجہ بالا نکات میں استعمال کی نہ صرف اجازت دیتا ہے، بلکہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کو بھی اسلامی حدود و قیود کے ساتھ یعنی بیع کے اصولوں کی رعایت کے ساتھ اجازت دیتا ہے۔

موجودہ دور جس میں ہم رہ رہے ہیں، اسمیں ہمیں ایسی بہت ساری اشیاء کا استعمال کرنا ہوتا ہے جس کی حیثیت ضرورت کے زمرے میں آتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہم ان اشیاء کا استعمال کس طرح کرتے ہیں، چیزوں یا اشیاء کی حیثیت صرف استعمال کی حد تک ہونی چاہئے، موجودہ دور میں موبائل کا عمومی استعمال تقریبا فرد وافراد میں نشے اور عادت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ طبّی ماہرین بہت سے اجزاء کا مفرد استعمال یا ان کا مسلسل استعمال مضر قرار دیتے ہیں مگر چند پیچیدہ امراض میں ان اجزاء کا کسی دوسرے اجزاء کے ساتھ مرکبات کے طور پر استعمال کو شافی قرار دیتے ہیں۔ اگر اسی تمثیل کے زمرے میں رکھکر اسمارٹ فون کا استعمال کیا جائے تو معاشرے میں اس کے استعمال کی مثبت صورت نکل سکتی ہے۔

انسان ابتدائے آفریشن سے جن علوم میں سر کردہ رہا ہے، ان میں ایک حصہ ایجادات کا بھی رہا ہے، جیسے جیسے انسانی ذہن نے ارتقائی مراحل طے کئے، اسی رفتار سے اس نے اپنی معاشرت و معیشت، صنعت و حرفت، رہن سہن غرض ہر چیز کو بہتر سے بہتر اور آسان بنانے کی کوشش کی، جدید ماہرین ایجادات کی دنیا میں پہیے کی ایجاد کو سنگ میل گردانتے ہیں، ایجادات کا یہ پہیہ گھومتے ہوئے جب اٹھارویں صدی کے وسط میں پہنچا۔ تب دنیا کے طول و عرض میں پہلا صنعتی انقلاب برپا ہوا۔ جس کے ذریعے ہنر مندوں اور ساہوکاروں کا ایک گٹھ جوڑ عمل میں آیا۔ اس انقلاب کی وجہ سے معاشرتی ترقی کی نئی راہیں کھلیں۔ موجود دور میں

جس صنعتی انقلاب کا غلغلہ ہے، وہ مصنوعی ذہانیت یعنی (AI – Artificial intelligence) کا ہے۔ یہ انقلاب صنعتی انقلاب کی چوتھی کڑی ہے جس کا آغاز اکیسویں صدی کے پہلے عشرے سے ہوا۔ موجودہ اسمارٹ فونز بھی اسی صنعتی انقلاب کی پیداوار ہے۔ موجودہ ترقی کا محور کم و بیش مادی نوعیت کی چیزوں کے ذریعے انسانی نفس کو مشتعل اور ان کو ابھارنے کا ہے، کیونکہ جدید مغربی سوچ عرصے سے انسان کو صرف اس کے جبلی تقاضوں سے عبارت اور اس کی تسکین کیلئے جتن کرتی آئی ہے۔ جب کہ اس کے حیوانی وجود کو مشتعل کرنے سے جو معاشرتی و سماجی اور سب اہم روحانی وجود پر اس کے اثرات کو بالکل فراموش کر چکی ہے، اس کا بڑا سبب اٹھارویں صدی سے ان کے یہاں مذہب بیزاری کی جو روش شروع ہوئی، اس نے مادیت پسندی کے ماحول کے لئے راہ ہموار کی، کیونکہ سارے مذاہب انسانی شخصیت میں موجود روح کے قائل ہیں، جب کہ یہ مادی کلچر روح کا منکر ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسانی وجود میں روح کے جوہر کو یکسر مسترد کرنے سے جو روحانی عوارض پیدا ہوں گے، اس کا تدارک ممکن نہیں، اس کا تریاق اسلام نے چودہ سو سال پہلے دیا۔ جسکا تسلسل آج بھی جاری ہے، اگرچہ مادیت (جدیدیت اور سیکولر نظریات) نے اسلامی معاشرت پر بھی کاری ضرب لگائی ہے، مگر اس کے دفاع میں علماء، صلحاء اور صوفیاء ہر دور کی طرح اس دور میں بھی سیسا پلائی دیوار ثابت ہوئے ہیں، ضرورت اس امر کی ہے کہ اسمارٹ فونز کے ذریعے ایسے تحریری اور کلامی مواد کا سلسلہ ہو، جس کے زیر اثر معاشرے میں اس آلے سے استفادے کی بہتر سے بہتر صورت پیدا ہو۔

مولانا عبدالمتین

وقت اور زندگی کی قدر و قیمت

اور اس کے استعمال کی صحیح صورت

زندگی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ ایک مقصد حاصل کرنے کے لیے دی گئی ہے۔ اللہ رب العزت نے اسے بہت ہی مختصر رکھا ہے اور ساتھ یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ اس کو اپنی جنت اور آخرت بنانے میں گزار دو۔

اس مختصر زندگی میں وقت کی جتنی زیادہ قدر کی جائے گی اتنا ہی زندگی کا مقصد حاصل کرنا آسان ہوگا۔ وقت کی جس قدر ناقدری کی جائے گی مثلاً فضول اور بے مقصد کاموں میں وقت لگایا جائے گا تو ہم زندگی کے مقصد سے اتنا ہی دور ہوتے جائیں گے۔ لغویات، لایعنی اور فضول کاموں میں اپنا وقت ضائع کریں گے تو ہم اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ کوئی چیز اگر اپنے مقصد سے ہٹ کر استعمال کی جاتی ہے تو اس میں خرابیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ زندگی کا واحد مقصد اللہ کی رضا اور جنت کا حصول ہے۔ اس مقصد سے زندگی گزاری جائے گی تو یہ آسان محسوس ہوگی۔ ایسے شخص کے لیے عبادت کرنا، نیکی کرنا، صبر کرنا، لوگوں کی خدمت کرنا، حلال کا اہتمام کرنا وغیرہ سب آسان ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر کوئی زندگی کے مقصد کو بھول کر اللے تللے میں لگ جائے اور پیسہ بنانا، کمانا، اڑانا، گھومنا پھرنا، عالی شان گھر، منصب، شہرت، دولت وغیرہ ہی کو اپنا مقصد بنا لے تو وہ جلد پریشان ہو جائے گا۔ کچھ وقت کے بعد گلے شکوے شروع کر دے گا اور پھر بیماریوں میں مبتلا ہو کر اس کا کھیل ختم ہو جائے گا۔

اگر یہ دنیا بے مقصد کاموں کے لیے ہوتی تو اللہ تعالیٰ اسے اس قدر وسائل اور مسائل کے ساتھ نہ بناتے اور اگر اتنی ہی اچھی ہوتی تو زندگی اتنی مختصر نہ ہوتی۔ دنیا اور انسان دونوں کی زندگی ختم ہونے والی ہے، تبھی اللہ تعالیٰ نے آخرت کا نظام پیدا کیا تاکہ اس مقصد کو سامنے رکھ کر یہ تھوڑی سی زندگی اچھی طرح گزاری جائے اور پھر جنت میں ہمیشہ کے لیے خوش رہا جائے۔

زندگی کیا ہے؟

یہ جو ہماری زندگی کے مختلف دور ہیں مثلاً بچپن، لڑکپن، جوانی، ادھیڑ عمری، ضعیفی اور بڑھاپا وغیرہ یہ وقت کی پیداوار ہیں۔ وقت جس میں سیکنڈ، منٹ، گھنٹہ، دن، رات، ہفتہ، سال ہوتے ہیں، یہی زندگی ہے۔ زندگی کا ایک سیکنڈ بھی زندگی ہی کہلاتا ہے کیونکہ یہی سیکنڈ آگے جاکر منٹ، گھنٹے کا سفر طے کرکے کچھ سالوں بعد ہمارا لڑکپن ختم کرتا ہے، پھر کچھ زیادہ وقت کے بعد بڑھاپا اور پھر موت تک بھی یہی سیکنڈ لے جاتا ہے۔ یوں زندگی کا عارضی چراغ بجھ جاتا ہے۔ بقول خواجہ عزیز الحسن مجذوب۔

ہو رہی ہے عمر مثل برف کم
چپکے چپکے ، رفتہ رفتہ، دم بدم

زندگی اور وقت

عربی مقولہ ہے: **الوقت هو الحياة** یعنی ''وقت ہی زندگی ہے''۔ زندگی وقت سے ہے اور وقت زندگی سے ہے۔ لہٰذا جو اچھی اور بامقصد زندگی گزارنا چاہتا ہے وہ وقت کی قدر کرے۔ وقت کی قدر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ایک ایک سیکنڈ کی قدر کی جائے۔ جو سیکنڈ کی قدر کرے گا وہ منٹ اور گھنٹوں کی قدر کرے گا۔ پھر اسی طرح دن، رات، ہفتہ، مہینہ،

سال بھر کی قدر کرنا بھی آسان ہو جائے گا۔ معلوم ہوا کہ جو اپنا سیکنڈ ضائع کرتے ہیں وہ درحقیقت اپنی زندگی ضائع کر رہے ہوتے ہیں۔

گھڑی کی سیکنڈ کی سوئی ٹک ٹک کر کے ہمیں خبردار کر رہی ہوتی ہے کہ میں بظاہر آگے جا رہی ہوں لیکن تمہاری زندگی کم کرتی جا رہی ہوں۔ وقت آگے جا کر ہمیں موت کی طرف دھکیلتا جا رہا ہے۔ عربی محاورہ ہے: ''**الوقت کالسیف فان لم تقطعہ لقطعک**''، یعنی وقت تلوار کی طرح ہے، اگر تم نے (اس کا اچھا استعمال کر کے) اسے نہیں کاٹا تو یہ تمہیں کاٹ دے گا۔ اور وقت کی کاٹ ایسی ہے جس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ بچہ، جوان، بوڑھا، بادشاہ، امیر، غریب سب اس کی زد میں آجاتے ہیں اور یہ بڑی بے رحمی سے اپنا کام مکمل کر لیتا ہے۔

''سیٹ'' ہونے کا انتظار: ایک فضول خواہش

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں!

وقت ایک مرتبہ ہاتھ سے نکل جائے تو دوبارہ ہاتھ نہیں آتا۔ یہ وقت جو آج ہے، اگر نکل گیا تو موت تک نہیں آئے گا۔ اس لیے وقت کی قدر کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی قدر آج اور ابھی سے کی جائے۔ کل، پرسوں یا کسی معاملے کے طے ہونے کا انتظار نہ کیا جائے۔ زندگی میں سیٹ ہونا ممکن نہیں کیونکہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت بنائی ہے، دنیا نہیں۔ دنیا تو آزمائش کا گھر ہے، یہاں سیٹ ہونے کا انتظار کرنا سعیٔ لاحاصل ہے، سمجھ دار انسان مسائل کے ساتھ جینا سیکھتے ہیں۔ درحقیقت یہ سب شیطانی بہانے ہیں کہ پڑھائی سیٹ ہو جائے، نوکری سیٹ ہو جائے، گھر بار سیٹ ہو جائے، کاروبار سیٹ ہو جائے، صحت سیٹ ہو جائے اور پھر آخر میں یوں ہوتا ہے کہ مردے کو قبلہ رخ رکھ کر آواز لگائی جاتی ہے کہ ''اب سیٹ ہے۔''

ماضی، حال اور استقبال

جو اپنے آج کی فکر کرے گا اور اپنے عمل کو سدھارے گا، اس کا حال خود بخود درست ہو جائے گا۔ جس کا حال درست ڈگر پر ہے تو کچھ وقت کے بعد یہی حال ماضی بن چکا ہو گا اور اس طرح ماضی بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ اسی طرح استقامت کے ساتھ چلتا رہے تو یہی حال مستقبل میں بدل جائے گا۔ اس طرح ''اب''، ''آج'' اور ''حال'' کی فکر کرنے والے شخص کا ماضی، حال اور مستقبل تینوں سنور جائیں گے۔ اسے ماضی کا غم اور پچھتاوا جبکہ مستقبل کا خوف اور اندیشہ نہیں رہے گا۔ ان سب کا دار و مدار آج اور ابھی کے عمل پر ہے۔

موبائل فون اور فضولیات

موجودہ دور میں ہمارے وقت کو ضائع کرنے والی سب سے بڑی چیز ہم سب کی جیبوں میں موجود ''موبائل فون'' کی صورت میں چھوٹا سا آلہ ہی۔ یہ ہمیں وقت، بے وقت اپنے ساتھ مصروف کر لیتا ہے۔ ہم لاشعوری طور پر موبائل فون کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اس کے بغیر ہمیں زندگی ادھوری معلوم ہوتی ہے۔ موبائل فون کے دو چار فوائد کے چکر میں ہمارے عقائد و نظریات، عبادات و ریاضت، اخلاق و اقدار، معاشرتی تعلقات اور سب سے بڑی چیز یعنی ہمارا وقت تہس نہس ہو گیا ہے۔ ایک بزرگ فرمایا کرتے ہیں کہ موبائل فون دو چیزوں کا سرچشمہ ہے: ''شہوات اور شبہات''۔ اس کے ذریعے ہر انسان کو ایک ایسے سوشل میڈیائی مصنوعی انسان میں بدل دیا گیا ہے جو کہ ریلز اور ویڈیوز کو دیکھتے ہوئے اپنے ناقابل واپسی وقت کو بدترین درجے میں ضائع کرتا جا رہا ہے۔

ایمان والوں کی خوبیاں

اللہ رب العزت نے قرآن حکیم میں بہت سے مقامات پر لایعنی باتوں، لغویات اور وقت ضائع کرنے والے کاموں کی بہت ہی شدت کے ساتھ مذمت فرمائی ہے۔ سورۃ المومنون میں ارشاد ہوتا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ۔

''وہ ایمان والے کامیاب ہو چکے، جو اپنی نماز میں خشوع کا اہتمام کرتے ہیں، اور بے مقصد فضول کاموں کو نظر انداز کرنے والے ہوتے ہیں۔''

یہاں ایمان والوں کی ایک اہم خوبی یہ بتلائی گئی کہ وہ ایسے کاموں سے خود کو بچاتے ہیں جن میں نہ دین کا کوئی فائدہ ہے اور نہ دنیا کا۔ ایسے کام میں وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور زندگی بھی۔

سورۃ الفرقان میں ''عباد الرحمان'' کے عنوان سے اللہ کے خاص بندوں کی کچھ خوبیاں بیان فرمائی گئی ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ:

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا

''اور جب کسی فضول معاملے کے پاس سے گزرتے ہیں تو وقار کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔''

یعنی جب ایمان والوں کا گزر کسی ایسی جگہ سے ہوتا ہے جہاں فضول کام ہو رہے ہوں اور وقت ضائع کیا جا رہا ہو تو وہ وقار کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو جاتے ہیں، وہاں ٹھہرنا پسند نہیں کرتے۔

سورۃ القصص میں فرمان الٰہی ہے:

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ

''اور جب وہ کوئی بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اسے ٹال دیتے ہیں۔''

ان کے کانوں میں جب کوئی فضول بات پڑتی ہے جیسے غیبت، حسد، گالیاں، بے حیائی کا تذکرہ گانا بجانا، میوزک وغیرہ تو وہ ایمان والے وہاں توجہ نہیں لگاتے۔

وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ

''اور کہتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے اعمال۔''

حساب دینے کی فکر انہیں مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنی صلاحیت کو غلط جگہ استعمال ہونے سے بچائیں۔ پھر کہتے ہیں کہ:

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِيْنَ.

''تم پر سلام ہے، ہم نادان لوگوں سے الجھنا نہیں چاہتے۔''

یہ کہتے ہوئے سلامتی کی راہ لے لیتے ہیں کہ ہم جاہلوں سے نہیں الجھتے، کیونکہ جاہل سے سر کھپانا دیوار پر سر مارنے جیسا ہے جس سے اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔

وقت کی قدر کا آخری احساس

قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

وَلَوْ تَرٰٓي اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ.

''اور کاش تم وہ منظر دیکھو جب یہ مجرم لوگ اپنے رب کے سامنے سر جھکائے ہوئے (کھڑے) ہوں گے، (کہہ رہے ہوں گے کہ) ہمارے پروردگار! ہماری آنکھیں اور کان کھل گئے، اس لیے ہمیں (دنیا میں) دوبارہ بھیج دیجیے، تاکہ ہم نیک عمل کریں، ہمیں اب اچھی طرح یقین آچکا ہے۔''

جب انسان اپنی موت دیکھتا ہے تو پھر اس کی زبان پر بڑے ہی عجیب کلمات جاری ہوتے ہیں۔ کہتا ہے کہ اب تو حقیقت ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی اور کانوں سے سن لی، لہٰذا اگر ہمیں ایک موقع دے کر دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے تو ہم اس دفعہ بھرپور عمل کریں گے۔

فضولیات سے پاک جگہ ''جنت''

قرآن کریم میں جنت کی ایک خوبی یوں بیان کی گئی ہیں:

لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً.

''وہ (جنتی) اس میں کوئی فضول بات نہیں سنے گا۔''

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا.

''وہ (جنتی) اس میں نہ کوئی بے ہودہ بات سنیں گے نہ ہی کوئی جھوٹ۔''

وقت کی قدر و قیمت: حدیث نبوی ﷺ کی روشنی میں

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یغنیہ)

''کسی شخص کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی اور فضول باتوں کو چھوڑ دے۔''

مسلمان ہونے کی بہت سی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی بدولت فضولیات سے بچنے کی کوشش کی جائے۔

دو بڑی نعمتیں اور انسانی نفسیات

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(نعمتان مغبون فیہما کثیر من الناس: الصحۃ والفراغ)

''دو نعمتیں ایسی ہیں کہ اکثر لوگ ان نعمتوں کے حوالے سے دھوکے کا شکار ہیں: صحت اور فرصت۔''

صحت اور فرصت دو عظیم نعمتیں ہیں۔ ان کی عظمت وہ لوگ اچھی جانتے ہیں جو برسوں سے بیماری میں مبتلا ہیں اور وہ جو بے جا مصروفیت کی وجہ سے اپنی فیملی تک کو وقت نہیں دے پاتے۔

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ یہ دو نعمتیں ہیں تو بہت بڑی لیکن ان سے متعلق دھوکا بھی ایسا لگتا ہے کہ انسان بس یہ سمجھنے میں اپنے روز و شب گزارتا ہے کہ یہ نعمتیں ہمیشہ میرا ساتھ دیں گی اور میں سدا یوں ہی صحت مند رہوں گا۔ اسی طرح فرصت کے جو لمحات آج میسر ہیں وہ ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، ہم ماضی کو یاد کر کے خود کو کوستے ہیں کہ کاش میں فرصت کے لمحات کی کچھ قدر کرتا اور اپنے وقت کو کسی بہتر مشغلے میں لگاتا۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد اس جانب ہے کہ اپنی صحت کی قدر کرو اور اپنے بدن کی قوت کو آج ہی سے بھلائی کے کاموں میں لگا دو، نہ جانے کل تمہاری صحت کیسی رہے۔ اس

مغالطے سے نکلو کہ تمہارے اندر جو قوت اور طاقت آج موجود ہے وہ ہمیشہ رہے گی۔ اسی طرح فرصت کے جو لمحات تمہیں میسر ہیں ان کی قدر کرو۔ ان کو زیادہ سے زیادہ اپنی آخرت بنانے میں لگادو۔

نام نہاد ترقی یافتہ لوگ

موجودہ دور میں جن لوگوں کو زیادہ ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے ان کے گھریلو حالات معلوم کر کے انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ کسی نے سالوں سے اپنے بچوں کو نہیں دیکھا، کوئی اپنی ازدواجی زندگی سے محروم ہو چکا اور کوئی اپنے والدین کی خدمت کے لیے وقت نکالنا تو درکنار ان کے جنازے تک نہیں پہنچ سکا۔ وہ مصروفیت کس کام کی جو ہمیں کسی کی خوشی میں شریک نہ کر سکے! وہ عیش و آرام کس کام کا جس کے حاصل کرتے کرتے انسان اپنی صحت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لہٰذا صحت اور فرصت کے لمحات کی بھرپور قدر کی جائے۔

انسانی زندگی کا بہترین نقشہ

ایک حدیث مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ انسانی زندگی کا بہترین نقشہ کھینچتے ہوئے انتہائی تاکید فرماتے ہیں کہ پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو:

(۱) جوانی کو بڑھاپے سے پہلے

(۲) صحت کو بیماری سے پہلے

(۳) مال داری کو تنگ دستی سے پہلے

(۴) فرصت کو مصروفیت سے پہلے

(۵) زندگی کو موت سے پہلے

(مستدرک حاکم، راوی عبداللہ بن عباس ؓ)

اللہ رب العزت نے جوانی کی نعمت سے نوازا ہے تو اس کی توانائی کو ضائع کرنے کی بجائے اسے اللہ کی رضا میں لگادو۔ اللہ نے تمہیں صحت دی ہے، اس نعمت کو اللہ کی عبادت اور اللہ کے بندوں کی خدمت میں لگادو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال دیا ہے تو اسے زکوٰۃ، صدقات، خیرات، صلہ رحمی اور مستحق لوگوں پر لگاؤ۔ رب تعالیٰ نے تمہیں فرصت کے لمحات دیے ہیں ان کی قدر کرو اس سے پہلے کہ مصروفیت بہت بڑھ جائے۔ اور پھر سب سے بڑی بات اللہ نے تمہیں زندگی دی ہے، اس کو موت کے جھٹکے سے پہلے پہلے ناپ تول کر خرچ کرو۔

نیکی کا خیال آنا اور اسے ٹالنا

ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے عمل کو آج اور ابھی سے بدلنے کی جستجو کی جائے، اسے کل پر سوں پر ٹالا نہ جائے۔ ہمارے دل میں جب کسی نیک کام کے کرنے کا خیال آتا ہے تو یہ خیال درحقیقت اللہ کی طرف سے مہمان ہوتا ہے۔ اگر میزبان اپنے مہمان کو نظر انداز کرے تو مہمان بدظن ہو کر دوبارہ اس میزبان کے پاس جانا پسند نہیں کرتا۔

ایک شخص نے سونے سے پہلے ارادہ کیا کہ کل صبح اٹھ کر توبہ کروں گا اور اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کروں گا۔ یہ ارادہ کر کے وہ سو جاتا ہے لیکن زندگی وفا نہیں کرتی اور وہ صبح اٹھ نہیں پاتا۔ اس کا کل کا ارادہ ایک ناکام ارادے میں بدل جاتا ہے۔ لہٰذا عمل کی اصل قوت یہی ہے کہ جب اس کا ارادہ کیا جائے تو اسی وقت اسے کر لیا جائے۔

شیطان کبھی یہ نہیں کہتا کہ تم نماز نہ پڑھو بلکہ وہ یوں کہتا ہے کہ نماز پڑھنا بہت اچھی بات ہے، ضرور پڑھنی چاہیے لیکن تم کل سے پڑھ لینا، جمعے کے مبارک دن سے نہا دھو کر شروع کر دینا یا رمضان المبارک کے مہینے میں شروع کر دینا۔ پھر وہ ''کل'' موت تک نہیں آتی۔

معمولات کو منظم کرنا

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ہم اپنے اوقات کو تقسیم کریں۔ چوبیس گھنٹے کوئی کم وقت نہیں ہے۔ وقت میں بے برکتی کی سب سے بڑی وجہ اسے منظم نہ کرنا ہے۔ کس وقت کیا کرنا ہے، یہ طے ہونا بہت ضروری ہے۔

کامیاب زندگی گزارنے کے لیے لازم ہے کہ اپنے وقت کو اس انداز سے تقسیم کیا جائے کہ سب معاملات کو ضرورت کے مطابق وقت دیا جاسکے۔ کسی ایک کام کو زیادہ وقت دینا اور دوسرے کام کو معمولات سے خارج کرنا ناکام طرز زندگی کی علامت ہے۔

(۱) سب سے پہلے اپنے اندر وقت کی قدر کا احساس بیدار کیا جائے۔

(۲) اپنی زندگی کا مقصد سمجھا جائے۔

(۳) کون سا کام کرنے کی صلاحیت زیادہ ہے، اسی کو اولین ترجیح بنایا جائے۔

(۴) دن بھر میں کچھ نہ کچھ نیا سیکھنے کے لیے ضرور وقت نکالا جائے۔

وقت کی تنظیم کا آسان طریقہ کار

اپنے دن بھر کے اوقات کو چار کاموں میں تقسیم کیا جائے:

(۱) عبادات: اس میں نماز روزہ، ذکر مناجات کا اہتمام ہو۔

(۲) معاش: ہر وہ حلال مصروفیت جائز ہے جس سے ہمارا گزر بسر ہو جائے۔

(۳) آرام: نیند رات کو جلدی سو کر پوری کی جائے۔ رات کے آخری پہر اٹھ کر عبادت کی کوشش کی جائے۔

(۴) خدمت: لوگوں کی عیادت، تعزیت، والدین کی زیارت، علاج معالجہ، اہل خانہ کو وقت دینا، بچوں کی تربیت، رشتہ دار، پڑوسی، دوست، احباب، متعلقین کے کام آنا۔ ان کے

غم اور خوشی میں شریک ہونا۔ بیوہ، مسکین، یتیم، محتاج اور ضرورتمندوں کی مشکلات حل کرنا

۔

اس کے ساتھ دعوت دین، تعلیم وتربیت، تصنیف وتالیف، تحقیق وتدریس، سیاست وجہاد، رفاہی اور فلاح وبہبود کے مختلف سلسلے جن سے مخلوق خدا اور ملت کی خدمت کی جاسکتی ہے۔

خواتین کے لیے خدمت کے ان تمام امور سے ہٹ کر ایک بہت بڑا باب یہ ہے کہ وہ اپنے گھر، شوہر اور بچوں کی خدمت میں خود کو لگائیں جو کہ حدیث مبارکہ کے مطابق ان کے لیے بہت بڑی بشارت کا ذریعہ ہے۔ مرد حضرات اپنے گھریلو امور سے بے فکر ہو کر مخلوق اور اُمت کی جو خدمت کرتے ہیں، اس کا اجر خواتین کو برابر ملتا رہتا ہے، کیونکہ ان کی گھریلو خدمات کی وجہ ہی سے مرد اتنے بڑے پیمانے پر کام کرنے کے لائق بنتے ہیں۔

خلاصہ کلام

جو اپنے وقت کی قدر کرے گا وہ اپنی زندگی کی قدر کرے گا۔ جو اپنی زندگی کی قدر کرے گا وہ اس زندگی کو منظم طریقے سے گزار سکے گا۔ جو منظم طریقے سے زندگی گزارے گا وہ دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب رہے گا۔ انشاءاللہ۔

محمد عبداللہ قاسمی

بد گمانی کے اسباب اور

معاشرے پر پڑنے والے اس کے اثرات

اسلام ایک عالمگیر اور آفاقی مذہب ہے، پوری انسانیت کے لیے ایک زندہ جاوید دستور حیات ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کا واضح اور جامع حل موجود ہے۔ عبادت ہو یا معاشرت، اخلاقیات ہو یا سماجیات، سیاست ہو یا معیشت ہر شعبے میں یہ انسان کی ٹھوس رہنمائی کرتا ہے۔ معاشرتی زندگی کے بارے میں بنیادی طور پر اسلام یہ ہدایت دیتا ہے کہ وہ آپس میں محبت والفت، تعاون وہمدردی اور اخوت وبھائی چارگی کے ساتھ زندگی گزاریں، اور ایسے معاشرے کی تعمیر میں حصہ لیں جس کی بنیاد باہمی اتحاد واتفاق اور ایثار وقربانی پر ہو۔ دین اسلام نے مسلمانوں کو تاکیدی طور پر ہر ایسی چیز سے منع کیا ہے جو آپسی تعلقات پر برے اور منفی اثرات ڈالتی ہیں، اور جن چیزوں سے معاشرے کی فضا مکدر ہوتی ہے۔

آپسی تعلقات میں رخنہ ڈالنے والی اور محبت والفت کی خوشگوار فضا کو مکدر اور مسموم کرنے والی چیز بد گمانی ہے۔ بد گمانی وہ زہر ہلاہل ہے جو اجتماعی زندگی کی بنیادوں کو کمزور کر دیتا ہے، اور مہر ووفا اور محبت والفت کے پائیدار رشتے کو بغض وعناد اور نفرت ودشمنی سے تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ وہ جان لیوا مرض ہے کہ جب کوئی جماعت اور گروہ اس کا شکار ہوتا ہے تو اس میں بے اعتمادی اور بے اطمینانی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے، اور ان میں ایک دوسرے پر الزامات واتہامات کا ایک لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے، اور جس قوم کے افراد میں بد گمانی کا زہر سرایت کر جائے، ان میں نفرت وعداوت اور قتل وغارت گری کی فضا عام ہو جاتی ہے اور ان کی ساری کوششیں اور دماغی توانائیاں باہمی خانہ جنگی پر صرف ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کے افراد

عمومی طور پر اس مرض کے شکار ہوں تو ان کی ترقیوں کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں، اور وہ علم وفن اور سیاست ومعیشت میں مفلوج اور ناکارہ ثابت ہوتے ہیں۔

بدگمانی کی ممانعت

اسی وجہ سے شریعت مطہرہ نے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے حسن ظن رکھنے کی سخت تاکید کی ہے، اور بغیر کسی بنیاد اور معقول سبب کے دوسروں کے بارے میں غلط رائے قائم کرنے سے منع کیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

اے ایمان والو! کثرت گمان سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ (الحجرات)

ایک روایت میں آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، دوسروں کی ٹوہ میں نہ لگو، دوسروں کی جاسوسی نہ کرو، دوسروں پر بڑھنے کی بے جا ہوس نہ کرو، نہ آپس میں حسد کرو، اور بغض رکھو، اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن کر رہو۔

ایک روایت میں ہے آپ ﷺ نے خانہ کعبہ کو دیکھ کر فرمایا: اے خانہ کعبہ! تیری عظمت کو سلام، تو کتنا عظیم الشان ہے! تو کتنا قابل تکریم ہے! لیکن ایک مسلمان اللہ کی نگاہ میں تجھ سے زیادہ معزز ہے، (کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے تیری ایک چیز (حرمت پامال کرنے) کو حرام کیا ہے، اور مسلمان کی تین چیزوں کو حرام کیا ہے، مؤمن کی جان، مؤمن کا مال اور مؤمن سے بدگمانی رکھنا حرام کیا گیا ہے۔ حضرت علی ؓ فرماتے ہیں: مؤمن سے بدگمانی رکھنا کمینگی کی علامت ہے۔ حضرت امام غزالی ؒ فرماتے ہیں: جب تم کسی انسان کو دیکھو کہ وہ لوگوں سے بدگمانی رکھتا ہے، اور ان کے عیوب تلاش کرتا ہے تو تم یقین کر لو کہ وہ بد باطن ہے۔

بدگمانی کے مفاسد ونقصانات

بدگمانی ایسا سنگین گناہ ہے کہ اس سے دیگر برائیاں جنم لیتی ہیں، اور معاشرے میں بہت سے اخلاقی مفاسد وجود میں آتے ہیں۔ بدگمانی کی وجہ سے نہ صرف انفرادی اور شخصی نقصان

ہوتا ہے، بلکہ بہت سے اجتماعی نقصانات اس پر مرتب ہوتے ہیں۔ ذیل میں بدگمانی کے نقصانات کا اختصار کے ساتھ تذکرہ کیا جاتا ہے:

ذہنی کوفت کا باعث

دوسروں کے بارے میں غلط رائے قائم کرنے سے انسان کا چین وسکون رخصت ہو جاتا ہے، اور اس کا دل ہمیشہ تشویش وپراگندگی کا شکار رہتا ہے، کیونکہ ایک انسان جب دوسروں کے بارے میں بغیر کسی معقول سبب کے غلط رائے قائم کرتا ہے، تو ان کے ساتھ اختلاط اور میل جول چھوڑ دیتا ہے۔ اگر ان افراد سے جن کے بارے میں یہ بدگمانی رکھتا ہے سامنا ہو جائے تو جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہے، اور اس کے دل ودماغ پر ہمیشہ یہ فکر سوار رہتی ہے کہ فلاں جس کے متعلق میں بدگمان ہوں اس کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھوں، اور اس کی برائیاں اور مفاسد میرے علم واطلاع میں آئیں۔

بہت سی برائیوں کا پیش خیمہ

بدگمانی ایسا گناہ ہے کہ جب انسان کسی سے بدگمان ہو جاتا ہے تو معاملہ صرف بدگمانی تک ہی محدود نہیں رہتا، بلکہ یہ بے شمار گناہوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ بدگمانی پیدا ہونے کے بعد فطری طور پر انسان اس شخص کی ٹوہ میں لگ جاتا ہے جس کے متعلق اس نے غلط رائے قائم کی ہے، اس کی خامیوں اور کوتاہیوں سے واقفیت حاصل کرنے کی فکر اس پر سوار ہو جاتی ہے، اور بڑے شوق ورغبت سے اس کی غیبت سنتا ہے، اس کے پیٹھ پیچھے برائیاں بیان کرتا ہے، اس کی طرف ایسی باتوں کی نسبت کرتا ہے جس سے وہ بری اور پاک ہے، اور جب یہ چیزیں اپنی انتہاء کو پہنچ جاتی ہیں، اور اس کی بغض وعداوت کا شجر زقوم مضبوط اور تناور ہو جاتا ہے تو پھر انسان کو اس کو نقصان پہنچانے، بلکہ بسا اوقات اس کو آخری انجام تک پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ چونکہ بدگمانی سے بہت سی معاشرتی برائیاں وجود پذیر ہوتی ہیں، اسی لیے قرآن وحدیث میں بدگمانی سے ممانعت کے بعد متصلاً ٹوہ میں لگنے، خامیاں تلاش کرنے، غیبت کرنے، حسد وبغض رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔ دراصل اس سے اس بات کی طرف اشارہ

مقصود ہے کہ مذکورہ برائیاں بدگمانی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص بدگمانی میں مبتلا ہو گیا، اور بدگمانی نے اس کے دل میں اپنی جڑیں مضبوط کر لیں تو مذکورہ برائیوں سے اس کے دامن شرافت کا داغدار نہ ہونا بہت ہی مشکل ہے۔

آپسی تعلقات پر برے اثرات

بدگمانی سے بہت سے اجتماعی اور معاشرتی نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ چاند سورج کی طرح یہ ایک سدا بہار حقیقت ہے کہ اجتماعی زندگی کو خوش گوار اور کیف آور رکھنے کے لیے محبت والفت اور باہمی اعتماد ویقین کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ بدگمانی وہ خطرناک مرض ہے جو سب سے پہلے اعتماد ویقین کے شیش محل کو پیوند خاک کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے گلشن محبت کے کھلے ہوئے پھول مرجھا جاتے ہیں۔ تعاون وہمدردی کی نہر رواں خشک اور مضمحل ہو جاتی ہے، اور ایثار وقربانی کا شجر طوبیٰ خزاں نصیب ہواؤں کی نذر ہو جاتا ہے، اور معاشرے میں بغض وعداوت کا شجر زقوم پوری آب وتاب کے ساتھ برگ وبار نکالتا ہے، اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی جڑیں مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہیں، اور وہ اپنے بے ذائقہ اور بدبودار پھلوں سے معاشرے کی پوری فضا کو مسموم کر دیتا ہے۔ نتیجتہ اس معاشرے میں ایسی اخلاقی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ الامان والحفیظ، اور وہی معاشرہ جو پہلے الفت ومحبت کا گہوارہ تھا، اب بغض وعناد کا مرکز بن جاتا ہے۔ وہی معاشرہ جو پہلے انسانیت وہمدردی کا نشان امتیاز تھا، حیوانیت ودرندگی کی پہچان بن جاتا ہے، وہی معاشرہ جو ترقی وکامیابی کی شاہ راہ پر محو سفر تھا، اب ادبار وتنزلی کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔

بدگمانی کے اسباب

بدگمانی چونکہ بہت ہی مہلک اور بے شمار گناہوں کا مقدمہ ہے، اس لیے اس کے اسباب کو جاننا بھی از حد ضروری ہے، تاکہ ہم بدگمانی اور اس کے اسباب سے کنارہ کش رہیں، اور اسلامی اصولوں کے مطابق ہم زندگی بسر کر سکیں۔ بدگمانی کے بہت سے اسباب ہیں، ذیل میں چند کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

گناہ میں مبتلا ہونا

بد گمانی کا ایک سبب یہ ہے کہ خود انسان گناہوں میں مبتلا ہوتا ہے، طرح طرح کی اخلاقی برائیاں اس کی عملی زندگی میں پائی جاتی ہیں، چنانچہ جن گمراہ کن خطوط پر وہ زندگی بسر کرتا ہے، دوسروں کے متعلق بھی وہ یہی سوچتا ہے، اگر وہ بدکار اور فاسق وفاجر ہے تو دوسروں کو بھی اس مرض کا شکار سمجھتا ہے۔ اگر وہ جھوٹ، وعدہ خلافی اور امانت میں خیانت کرنے کا عادی ہے تو دوسروں کو بھی ان باتوں کا عادی سمجھتا ہے۔

معلومات کی کمی

بد گمانی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انسان جس کے متعلق بد گمانی رکھتا ہے، اس کے بارے میں مکمل معلومات اسے نہیں ہوتیں۔اس کے شب وروز کے معمولات اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں، اس کا علمی ودینی مقام ومرتبہ کا اسے پتہ نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے وہ بعض ظاہری امور کو دیکھ کر اس کے متعلق غلط رائے قائم کرلیتا ہے، اور اس سے بد گمان ہو جاتا ہے۔

بد گمانی کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان منفی سوچ کا عادی ہوتا ہے، ہر چیز کو وہ تنقیدی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ظاہر ہے جب ایسا انسان کسی چیز کو دیکھے گا تو منفی اور غیر مثبت زاویہ سے دیکھے گا، جس سے بد گمانی پیدا ہونا لازمی ہے۔

کسی متعین شخص سے شکایت

بد گمانی کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کو کسی خاص اور متعین فرد سے کوئی شکایت ہوئی ہے، مثلا اس فرد نے اس کو نقصان پہنچایا ہے، چنانچہ اس فرد کا جس جماعت اور تنظیم سے تعلق ہے، اس پوری جماعت اور تنظیم سے انسان بد گمان ہو جاتا ہے، اور اس کے متعلق غلط

رائے قائم کرلیتا ہے، حالانکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس جماعت کے سارے افراد بد دیانت ہوں، اوران کا رویہ غیر درست ہو۔

بد گمانی سے بچنے کی تدابیر

جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا گیا کہ بد گمانی سے نہ صرف انفرادی اور شخصی نقصانات ہوتے ہیں، بلکہ بہت سارے اجتماعی نقصانات بھی ہوتے ہیں، اسی لیے اس سے بچنا ہر مسلمان کے لیے ازبس ضروری ہے۔ ذیل میں بد گمانی سے بچنے کی تدابیر اختصار کے ساتھ ذکر کی جارہی ہیں:

اعمال کی اصلاح

سب سے پہلے انسان اپنے اعمال کی اصلاح کرے، اور شریعت کے بتائے ہوئے رہنمایانہ خطوط پر گامزن رہے۔ آپ ﷺ کی ایک ایک سنتِ مبارکہ کو اپنی عملی زندگی میں لانے کی کوشش کرے۔ جب انسان کی ساری توجہات کا محور اپنی زندگی کی اصلاح ہوگی، اور اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو دور کرنا اس کا مطمح فکر ہوگا تو پھر دوسروں کے متعلق بد گمان ہونے اور غلط رائے قائم کرنے کا اسے موقع نہیں ملے گا۔

آج ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم اپنی عملی واخلاقی کوتاہیوں سے بے پرواہ ہو کر دوسروں پر تبصرہ کرنے اور ان کو ہدف تنقید بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر ہر مسلمان اپنی اصلاح کی فکر کرلے اور اپنی غلطیوں اور عیوب پر نظر رکھے تو اس کا دل کسی کے بارے میں غلط رائے قائم کرنے سے شرمائے گا، اس کی زبان کسی کی برائی بیان کرنے میں جھجک محسوس کرے گی، اس کے کان کسی فرد کی برائی سننے میں اباء کریں گے۔

آیات واحادیث کا استحضار

جب دل میں کسی کے متعلق بد گمانی پیدا ہو تو ان آیات واحادیث کا استحضار کرے جن میں مسلمانوں سے حسن ظن رکھنے کی تلقین کی گئی ہے، اور ان کے متعلق غلط رائے قائم کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور انسان اپنے دل میں یہ تصور بٹھائے کہ بد گمانی جس کو میں ابھی معمولی اور ہلکا سمجھ رہا ہوں بعد کو یہ بڑے گناہوں کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے، اور میری اخروی زندگی کے لیے تباہ کن ہو سکتی ہے، اور روز قیامت اللہ تعالی کے یہاں اس بارے میں مواخذہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر میں فلاں شخص کے متعلق حسن ظن رکھتا ہوں اور اس کے متعلق اچھی رائے قائم کرتا ہوں تو مجھے قرآن حکم پر عمل کرنے کا ثواب ملے گا، اور اللہ کے حضور اس بارے میں مجھ سے باز پرس نہیں کی جائیں گی۔

گمان کا خاتمہ

جب دل میں کسی سے بد گمانی پیدا ہو جائے تو جلد سے جلد بد گمانی کو دل سے نکالنے کی کوشش کرے، اور اس کے قول و عمل کو اچھے معنی پہنائے، اور اس کی خوبیوں اور کمالات کو سوچے، اور اپنی کوتاہیوں اور خطاؤں کی طرف نظر کرے، یہ عمل کرنے سے ان شاء اللہ بد گمانی ختم ہو جائے گی، اور اس کو انسان کے دل میں جڑیں مضبوط کرنے کا موقع فراہم نہیں ہو گا۔

تحقیق و جستجو

اگر کوئی حساس اور نازک مسئلہ ہے، اور دل سے بد گمانی ختم ہو رہی ہے، تو جس انسان سے بد گمانی ہوئی ہے اس سے جا کر حقیقت حال دریافت کریں، اور اس کے سامنے اپنا خدشہ ذکر کریں، ظاہر ہے کہ جب حقیقت حال انسان کے سامنے آجائے گی تو بد گمانی ختم ہو جائے گی، اور اس کے متعلق اچھی اور نیک رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی۔

ریٹائر کمانڈر محمود اقبال صاحب

جدید ٹیکنالوجی کے کرشمے

1998ء میں کوڈک میں 70،000 ،1 ملازمین کام کر رہے تھے۔ وہ دنیا میں 85 فیصد فوٹو پیپر فروخت کرتے تھے۔ کچھ سالوں میں ڈیجیٹل فوٹو گرافی نے انہیں بازار سے نکال دیا۔ کوڈک دیوالیہ ہو گیا۔ اس کے تمام ملازمین سڑک پر چلے گئے۔ ان سب کے معیار میں کوئی کمی نہیں تھی۔ پھر بھی وہ مارکیٹ سے باہر۔ وجہ؟ وقت کے ساتھ ساتھ وہ تبدیل نہیں ہوئے۔

آنے والے 10 سالوں میں دنیا پوری طرح سے تبدیل ہو جائے گی۔ آج چلنے والی صنعتوں میں سے 70 سے 90 بند ہو جائیں گی۔ چوتھے صنعتی انقلاب میں خوش آمدید۔ اوبر (Uber) صرف ایک سافٹ ویئر ہے، اپنی ایک بھی کار نہ ہونے کے باوجود وہ دنیا کی سب سے بڑی ٹیکسی کمپنی ہے۔

ایئر بی این بی (Air BNB) دنیا کی سب سے بڑی ہوٹل کمپنی ہے حالانکہ اس کے پاس اپنا کوئی ہوٹل نہیں ہے۔ اب امریکہ میں نوجوان وکلاء کے لئے کوئی کام باقی نہیں ہے کیونکہ آئی بی ایم واٹسن (IBN Watson) سافٹ ویئر ایک لمحے میں بہتر قانونی مشورے دیتا ہے۔ اگلے 10 سالوں میں 90% امریکی وکیل بے روزگار ہو جائیں گے۔ جو 10 فیصد بچ جائیں گے وہ سپر ماہر ہوں گے۔

واٹسن نامی سافٹ ویئر انسانوں کے مقابلے میں کینسر کی تشخیص 4 گنا زیادہ درست طریقے سے انجام دیتا ہے۔ 2030ء تک کمپیوٹر انسانوں سے زیادہ ذہین ہوں گے۔ اگلے 10

سالوں میں 90 فیصد کاریں پوری دنیا کی سڑکوں سے غائب ہو جائیں گی۔ جو بچ جائیں گی۔ وہ یا تو الیکٹرانک کاریں ہوں گی یا ہائبرڈ۔ سڑکیں خالی ہوں گی۔ پٹرول کی کھپت میں 90 فیصد کمی واقع ہو گی۔ تمام عرب ممالک دیوالیہ ہو جائیں گے۔ آپ کو اوبر جیسے سافٹ ویر سے کار مل جائے گی۔ کچھ ہی لمحوں میں ڈرائیور لیس گاڑی آپ کے دروازے پر کھڑی ہو گی۔ اگر آپ اسے کسی کے ساتھ شیئر کر لیتے ہیں تو وہ سواری آپ کو موٹر سائیکل سے بھی سستی پڑے گی۔ کاروں کے ڈرائیور لیس (Driverless) ہونے کی وجہ سے 99 فیصد حادثات بند ہو جائیں گے۔ زمین پر ڈرائیور جیسا کوئی روزگار نہیں چھوڑا جائے گا۔ جب 90 فیصد کاریں شہروں اور سڑکوں سے غائب ہو جائیں گی۔ تو ٹریفک اور پارکنگ جیسے مسائل خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ کیونکہ ایک کار 20 کاروں کے برابر ہو گی۔

5 یا 10 سال پہلے ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں پی سی او (PCO) نہ ہو۔ پھر جب موبائل فون سب کی جیب میں آیا۔ تو پی سی او بند ہونا شروع ہو گئے۔ تمام پی سی او والے لوگوں نے فون کاری چارج بیچنا شروع کر دیا۔ اب یہاں تک کہ ری چارج آن لائن بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ آج کل مارکیٹ میں ہر تیسری دکان پر موبائل فون ہیں۔ فروخت، خدمت، ری چارج، لوازمات، مرمت، بحالی وغیرہ وغیرہ۔

اب اکثر لین دین اے ٹی ایم سے کیا جا رہا ہے۔

اب لوگوں نے اپنے فون سے ہی ریلوے ٹکٹ بک کرنا شروع کر دی ہیں۔

اب پیسوں کا لین دین بھی تبدیل ہو رہا ہے۔ کرنسی نوٹ کو پہلے پلاسٹک منی نے تبدیل کیا تھا۔ اب یہ ڈیجیٹل ہو گئی ہے۔

دنیا بہت تیزی سے بدل رہی ہے۔

آنکھیں اور کان کھلے رکھیں ورنہ آپ پیچھے رہ جائیں گے۔ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہونے کے لئے تیار رہیں۔ لہٰذا ایک شخص کو چاہیے کہ وہ وقت گزرنے کے ساتھ اپنے کاروبار کی نوعیت کو بھی بدلتا رہے۔ کاروبار کو وقت کے ساتھ ساتھ اپ گریڈ کریں۔ وقت کے ساتھ آگے بڑھیں اور کامیابی حاصل کریں تاکہ اچھا وقت گزاریں۔

مولانا سلیمان ندوی ؒ

سیرت کا ایک روشن پہلو

نبی اکرم ﷺ کی سیرت کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے بحیثیت ایک پیغمبر کے اپنے پیروکاروں کو جو نصیحت فرمائی اس پر سب سے پہلے خود عمل کر کے دکھایا۔

کثرت ذکر

نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کو خدا کی یاد اور محبت کی نصیحت کی، صحابہ کرام ؓ کی زندگی میں اس تلقین کا جو اثر نمایاں ہوا وہ تو الگ چیز ہے، خود نبی اکرم ﷺ کی زندگی کہاں تک اس کے مطابق تھی، اس پر غور کرو، شب و روز میں کب کوئی ایسا لمحہ تھا جب آپ ﷺ کا دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور آپ ﷺ کی زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہو۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، پہنتے اوڑھتے ہر حالت میں اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی حمد زبان مبارک پر جاری رہتی تھی۔ آج حدیث کی کتابوں کا ایک بڑا حصہ انہی مبارک کلمات اور دعاؤں کے بیان میں ہے جو مختلف حالات اور مختلف وقتوں کی مناسبت سے آپ ﷺ کی زبان فیض اثر سے ادا ہوئیں۔ حصن حصین دو سو صفحوں کی کتاب صرف ان کلمات اور دعاؤں کا مجموعہ ہے جس کے فقرے فقرے سے اللہ تعالیٰ کی محبت و عظمت، جلالت اور خشیت نمایاں ہیں اور جن سے ہر وقت زبان اقدس تر رہتی تھی۔ قرآن نے اچھے بندوں کی یہ تعریف کی ہے:

جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کیا کرتے ہیں۔ یہی آپ ﷺ کی زندگی کا نقشہ تھا، چنانچہ سیدہ عائشہ ؓ کہتی ہیں: نبی اکرم ﷺ ہر وقت اور ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں مصروف رہتے تھے۔

نماز سے تعلق

نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کو نماز کا حکم دیا، مگر خود آپ کا حال کیا تھا، عام پیروکاروں کو تو پانچ وقتوں کی نماز کا حکم تھا مگر خود آپ آٹھ وقت نماز پڑھتے تھے۔ طلوع آفتاب کے بعد اشراق، کچھ اور دن چڑھنے پر چاشت، پھر ظہر، پھر عصر، پھر مغرب، پھر عشاء، پھر تہجد پھر صبح ۔عام مسلمانوں پر تو صبح کو دو رکعتیں، مغرب کو تین اور بقیہ اوقات میں چار چار رکعتیں فرض ہیں، کل شب و روز میں سترہ رکعتیں ہیں، مگر نبی اکرم ﷺ ہر روز کم و بیش پچاس ساٹھ رکعتیں ادا فرمایا کرتے تھے۔

پنج وقتہ نماز کی فرضیت کے بعد تہجد کی نماز عام مسلمانوں سے معاف ہوگئی تھی مگر نبی اکرم ﷺ اس کو بھی تمام عمر شب میں ادا فرماتے رہے، اور پھر کیسی نماز کہ رات بھر کھڑے کے کھڑے رہ جاتے، کھڑے کھڑے پاؤں مبارک پر ورم آجاتا۔ سیدہ عائشہ ؓ کہتیں: اللہ تعالیٰ نے تو آپ کو ہر طرح معاف کر دیا ہے پھر اس قدر کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں؟ فرماتے اے عائشہ! کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ یعنی یہ نماز خشیت الٰہی سے نہیں بلکہ محبت الٰہی اس کا منشاء ہے۔ رکوع میں اتنی دیر جھکے رہتے کہ دیکھنے والے کہتے کہ شاید آپ سجدہ کرنا بھول گئے۔

نبوت کے آغاز ہی سے آپ ﷺ نماز پڑھتے تھے۔ کفار آپ ﷺ کے سخت دشمن تھے، مگر بایں ہمہ عین حرم میں جا کر سب کے سامنے نماز پڑھتے تھے۔ کئی دفعہ نماز کی حالت میں دشمنوں نے آپ ﷺ پر حملہ کیا، مگر اس پر بھی اللہ کی یاد سے باز نہ آئے۔ سب سے سخت موقع نماز کا وہ ہوتا تھا جب کفار کی فوجیں مقابل ہوتیں، تیر و خنجر چلتے ہوتے لیکن ادھر نماز کا وقت آیا، اور ادھر صفیں درست ہو گئیں۔ بدر کے معرکے میں تمام مسلمان دشمنوں کے مقابل کھڑے تھے مگر خود نبی اکرم ﷺ اللہ کے آگے سجدے میں جھکے ہوئے تھے۔

تمام عمر میں کوئی نماز عموماً اپنے وقت سے نہیں ہٹی اور نہ دو وقتوں کے علاوہ کبھی کسی وقت کی نماز قضا ہوئی۔ ایک تو غزوۂ خندق میں کافروں نے عصر کی نماز کا موقع نہیں دیا، اور ایک دفعہ اور کسی غزوہ کے سفر میں رات بھر چل کر صبح کو تمام لوگ سو گئے تو آپ ﷺ نے دن کو نماز قضا ادا کی۔

اس سے زیادہ یہ کہ مرض موت میں شدت کا بخار تھا، تکلیف بہت تھی مگر نماز حتیٰ کہ جماعت بھی ترک نہ ہوئی۔ قوت جواب دے چکی تھی مگر دو صحابیوں کے کندھوں پر سہارا لے کر مسجد میں تشریف لائے۔ وفات سے تین دن پہلے جب آپ ﷺ نے اٹھنے کا قصد کیا تو غشی طاری ہوئی اور یہی حالت تین دفعہ پیش آئی، اس وقت نماز باجماعت ترک ہوئی۔ یہ اللہ کی عبادت گزاری اور یاد کا عملی نمونہ۔

روزے کے بارے میں آپ کے معمولات

نبی اکرم ﷺ نے روزہ کا حکم دیا۔ عام مسلمانوں پر سال میں تیس دن کے روزے فرض ہیں، مگر خود آپ ﷺ کی کیفیت کیا تھی؟ کوئی ہفتہ اور کوئی مہینہ روزوں سے خالی نہیں تھا۔ سیدہ عائشہ ؓ فرماتی ہیں: جب آپ ﷺ روزے رکھنے پر آتے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی افطار نہ کریں گے۔ نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو دن بھر سے زیادہ روزہ رکھنے کی ممانعت فرمائی مگر خود آپ کو یہ حال تھا کہ کبھی کبھی دو دو، تین تین دن بیچ میں کچھ کھائے پیے بغیر متصل روزہ رکھتے تھے، اور اس عرصے میں ایک دانہ بھی منہ میں نہیں جاتا تھا۔ صحابۂ کرام ؓ اس کی تقلید کرنا چاہتے تو فرماتے: تم میں سے کون میری مانند ہے، مجھ کو تو میرا آقا کھلاتا پلاتا ہے۔ سال میں دو مہینے شعبان اور رمضان کے پورے کے پورے روزوں میں گزرے۔ ہر مہینے کے ایام بیض (۱۳، ۱۴، ۱۵) میں اکثر روزے رکھتے محرم کے دس دن اور شوال کے چھ دن روزوں میں گزرتے۔ ہفتے میں سوموار اور جمعرات کا دن روزوں میں بسر ہوتا۔ یہ تھا روزوں کے متعلق آپ کا عملی نقشہ زندگی۔

زکوٰۃ وصدقات اور آپ ﷺ کا عملی نمونہ

نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کو زکوٰۃ اور خیرات کا حکم دیا تھا، تو پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا۔ سیدہ خدیجہ ؓ کی شہادت تم سن چکے ہو کہ انہوں نے کہا: یارسول اللہ! آپ قرض داروں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریبوں اور مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں۔ گو نبی اکرم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم سب کچھ چھوڑ کر میرے پیچھے آؤ، نہ گھر بار لٹا دینے کا حکم فرمایا، نہ آسمان کی بادشاہت کا دروازہ دولتمندوں پر بند کیا، بلکہ صرف یہ حکم دیا کہ اپنی کمائی میں سے کچھ دوسروں کو دے کر اللہ کا حق بھی ادا کرو۔

مگر خود آپ ﷺ کا عمل یہ رہا کہ جو کچھ آیا اللہ کی راہ میں خرچ ہو گیا۔ غزوات اور فتوحات کی وجہ سے مال واسباب کی کمی نہ تھی، مگر وہ سب غیروں کے لیے تھا، اپنے لیے کچھ نہ تھا۔ وہی فقر وفاقہ تھا۔ فتح خیبر کے بعد یعنی ۷ھ سے یہ معمول تھا کہ سال بھر کے خرچ کے لیے تمام ازواج مطہرات کو غلہ تقسیم کر دیا جاتا تھا، مگر سال تمام بھی نہیں ہونے پاتا تھا کہ غلہ ختم ہو جاتا تھا، کیونکہ غلے کا بڑا حصہ اہل حاجات کی نذر کر دیا جاتا تھا۔ سیدنا ابن عباس ؓ کہتے ہیں کہ آپ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے، اور سب سے زیادہ سخاوت آپ رمضان المبارک میں کرتے تھے۔

تمام عمر کسی سوالی کے جواب میں ''نہیں'' کا لفظ نہیں فرمایا۔ کبھی کوئی چیز تنہا نہیں کھاتے تھے، کتنی ہی تھوڑی چیز ہوتی مگر آپ سب حاضرین کو اس میں شریک کر لیتے تھے۔ لوگوں کو عام حکم تھا کہ جو مسلمان قرض چھوڑ کر مر جائے اس کی اطلاع مجھے دو کہ میں اس کا قرض ادا کروں گا، اور اس نے ترکہ چھوڑا ہو تو اس کے حقدار اس کے وارث ہوں گے۔ ایک دفعہ ایک بدو نے کہا: اے محمد! یہ مال نہ تیرا ہے اور نہ تیرے باپ کا ہے میرے اونٹ پر لاد دے۔ آپ نے اس کے اونٹ کو جَو اور کھجوروں سے لدوا دیا، اور اس کے کہنے کا برا نہ مانا۔ خود فرمایا کرتے: ''میں تو بانٹنے والے اور خزانچی کی حیثیت رکھتا ہوں، اصل دینے والا تو اللہ

ہے۔'' سیدنا ابوذر ؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کو میں آپ کے ساتھ گزر رہا تھا، راستے میں آپ نے فرمایا: ابوذر! اگر اُحد کا یہ پہاڑ میرے لیے سونا ہو جائے تو میں کبھی پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گذر جائیں اور اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس رہ جائے، البتہ یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کے لیے کچھ رکھ چھوڑوں۔

قارئین کرام! نبی اکرم ﷺ کے صرف خوشنما الفاظ نہ تھے بلکہ یہ آپ کے عزم صادق کا اظہار تھا، اور اسی پر آپ کا عمل تھا۔ بحرین سے ایک دفعہ خراج کا لدا ہوا خزانہ آیا، فرمایا کہ صحن مسجد میں ڈال دیا جائے، صبح کی نماز کے لیے آپ تشریف لائے تو دیکھنے والے کہتے ہیں کہ آپ نے خزانہ کے انبار کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا، نماز کے بعد ڈھیر کے پاس بیٹھ گئے اور تقسیم کرنا شروع کر دیا، جب سب ختم ہو گیا تو دامن جھاڑ کر اس طرح کھڑے ہو گئے کہ یہ گویا کوئی غبار تھا جو دامن مبارک پر پڑ گیا تھا۔

ایک دفعہ فدک سے چار اونٹوں پر غلہ لد کر آیا، کچھ قرض تھا وہ دیا گیا، کچھ لوگوں کو دیا۔ سیدنا بلال ؓ سے دریافت کیا کہ بچ تو نہیں رہا، عرض کی اب کوئی لینے والا نہیں اس لیے بچ رہا ہے، فرمایا جب تک دنیا کا یہ مال باقی ہے میں گھر نہیں جا سکتا۔ چنانچہ رات مسجد میں بسر کی۔ صبح کو سیدنا بلال ؓ نے آکر بشارت دی کہ یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو سبکدوش کر دیا۔ یعنی جو کچھ تھا وہ تقسیم ہو گیا۔ آپ نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

ایک دفعہ عصر کی نماز کے بعد خلاف معمول فوراً اندر تشریف لے گئے اور پھر باہر آ گئے، لوگوں کو تعجب ہوا، فرمایا مجھ کو نماز میں یاد آیا کہ سونے کا چھوٹا سا ٹکڑا گھر میں پڑا رہ گیا ہے خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ رات آ جائے اور وہ محمد کے گھر میں پڑا رہ جائے۔

سیدہ ام سلمہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ: ایک دفعہ آپ ملول اور رنجیدہ اندر تشریف لائے، میں نے سبب دریافت کیا، فرمایا: ام سلمہ! کل جو سات دینار آئے تھے شام ہو گئی اور وہ بستر پر پڑے رہ گئے۔ اس سے بڑھ کر نبی اکرم ﷺ مرض الوفات میں ہیں، بیماری کی سخت تکلیف

ہے، نہایت بے چینی ہے، لیکن اسی وقت یاد آتا ہے کہ کچھ اشرفیاں گھر میں پڑی ہیں، حکم ہوتا ہے کہ انہیں خیرات کر دو، کیا محمد اپنے رب سے اس طرح ملے گا کہ اس کے پیچھے اس کے گھر میں اشرفیاں پڑی ہوں۔ یہ تھی اس باب میں آپ ﷺ کی زندگی کی عملی مثال۔

زہد و قناعت میں آپ ﷺ کا طرز عمل

نبی اکرم ﷺ نے زہد و قناعت کی تعلیم دی، لیکن اس راہ میں آپ ﷺ کا طرز عمل کیا تھا؟ پڑھ چکے ہو کہ عرب کے گوشے گوشے سے جزیہ، خراج، عشر اور زکوٰۃ وصدقات کے خزانے لدے چلے آتے تھے، مگر امیر عرب کے گھر میں وہی فقر تھا، اور وہی فاقہ تھا نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد سیدہ عائشہ ؓ کہا کرتی تھی کہ آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے مگر دو وقت بھی سیر ہو کر آپ کو کھانا نصیب نہ ہوا۔ وہی بیان کرتی ہیں کہ جب آپ نے وفات پائی تو گھر میں اس دن کے کھانے کے لیے تھوڑے سے جَو کے سوا کچھ موجود نہ تھا، اور چند سیر جو کے بدلے میں آپ کی زرہ ایک یہودی کے ہاں رہن تھی۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ فرزند آدم کو ان چند چیزوں کے سوا کسی چیز کا حق نہیں:

رہنے کو ایک جھونپڑا، تن ڈھانپنے کو ایک کپڑا، پیٹ بھرنے کو روکھی سوکھی روٹی اور پانی۔ یہ محض الفاظ کی خوشنما بندش نہ تھی بلکہ یہی آپ ﷺ کی طرز زندگی کا عملی نقشہ تھا۔ رہنے کا مکان ایک حجرہ تھا جس میں کچی دیوار اور کھجور کے پتوں اور اونٹ کے بالوں کی چھت تھی۔ سیدہ عائشہ ؓ کہتی ہیں کہ آپ کا کپڑا کبھی تہہ کر کے نہیں رکھا جاتا تھا، یعنی جو بدن مبارک پر ہوتا تھا، اس کے سوا کوئی اور کپڑا ہی نہیں ہوتا تھا جو تہہ کیا جاتا۔

ایک دفعہ ایک سائل خدمت اقدس میں آیا، اور بیان کیا کہ سخت بھوکا ہوں، آپ ﷺ نے ازواج مطہرات کے پاس کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو ہو تو بھیج دیں، ہر جگہ سے یہی جواب آیا کہ گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ سیدنا ابو طلحہ ؓ کہتے ہیں ایک دن رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ مسجد میں زمین پر لیٹے ہیں، اور بھوک کی تکلیف سے کروٹیں بدل رہے

ہیں۔ایک دفعہ صحابہ کرام ؓ نے آپ کی خدمت میں فاقہ کشی کی شکایت کی اور پیٹ کھول کر دکھائے کہ ان پر ایک پتھر بندھا ہے۔آپ ﷺ نے شکم مبارک کھولا تو ایک کے بجائے دو پتھر بندھے تھے، یعنی دو دن سے فاقہ تھا۔اکثر بھوک کی وجہ سے آواز میں کمزوری اور نقاہت آجاتی تھی۔ایک دن دولت خانہ سے نکلے تو بھوکے تھے۔سیدنا ابوایوب انصاری ؓ کے گھر تشریف لے گئے وہ نخلستان سے کھجور توڑ لائے اور کھانے کا سامان کیا، کھانا جب سامنے آیا تو آپ ﷺ نے ایک روٹی پر تھوڑا سا گوشت رکھ کر فرمایا یہ فاطمہ کے گھر بھجوادو کئی دن سے اس کو کھانا نصیب نہیں ہوا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کو اپنی صاحبزادی سیدہ فاطمہ ؓ اور سیدنا حسنین ؓ سے بڑی محبت تھی، مگر یہ محبت امیر عرب نے بیش قیمت کپڑوں اور سونے چاندی کے زیوروں کے ذریعہ سے ظاہر نہیں فرمائی۔ایک دفعہ سیدنا علی ؓ کا دیا ہوا ایک سونے کا ہار سیدہ فاطمہ ؓ کے گلے میں دیکھا تو فرمایا: اے فاطمہ! تم کیا لوگوں سے یہ کہلوانا چاہتی ہو کہ محمد کی بیٹی گلے میں آگ کا طوق ڈالے ہوئے ہے۔سیدہ فاطمہ ؓ نے اسی وقت وہ طوق اتار کر بیچ ڈالا اور اس کی قیمت سے ایک غلام خرید کر آزاد کیا۔

اسی طرح ایک دفعہ سیدہ عائشہ ؓ نے سونے کے کنگن پہنے، تو اُتروادیے کہ محمد کو یہ زیبا نہیں۔فرمایا کرتے تھے کہ انسان کے لیے دنیا میں اتنا ہی کافی ہے جس قدر ایک مسافر کو زاد راہ۔یہ قول تھا اور عمل یہ تھا کہ ایک دفعہ کچھ جان نثار ملنے آئے تو دیکھا کہ پہلو میں چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں، عرض کی یارسول اللہ! ہم لوگ ایک نرم گدا بنا کر حاضر کرنا چاہتے ہیں۔فرمایا مجھ کو دنیا سے کیا غرض؟ مجھ کو دنیا سے اسی قدر تعلق ہے جس قدر اس سوار کو جو راستہ چلتے تھوڑی دیر کے لیے کہیں سایہ میں آرام کرتا ہے اور پھر آگے بڑھ جاتا ہے۔

۹ھ میں جب اسلام کی حکومت یمن سے شام تک پھیلی ہوئی تھی آپ کے توشہ خانے کی مالیت یہ تھی جسم مبارک پر ایک تہبند، ایک کھدری چارپائی، سرہانے ایک تکیہ جس میں خرمے کی چھال بھری تھی، ایک طرف تھوڑے سے جو، ایک کونے میں ایک جانور کی کھال،

کھونٹی میں پانی کے مشکیزے۔ یہ تھا زہد و قناعت کی تعلیم کے ساتھ اس پر آپ ﷺ کا عمل۔

ایثار اور صحیفہ سیرت

قارئین کرام! ایثار کا وعظ کہنے والوں کو تم نے بہت دیکھا ہو گا مگر کیا کسی ایثار کے وعظ کہنے والے کے صحیفہ سیرت میں اس کی مثال بھی دیکھی ہے اس کی مثال مدینے کی گلیوں میں ملے گی۔ نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کو ایثار کی تعلیم دی تو ساتھ ہی ان کے سامنے اپنا نمونہ بھی پیش کیا۔ سیدہ فاطمہ ؓ سے آپ کو جو محبت تھی وہ ظاہر ہے مگر ان ہی سیدہ فاطمہ ؓ کی عسرت اور تنگدستی کا یہ عالم تھا کہ چکی پیستے پیستے ہتھیلیاں گھس گئی تھیں اور مشک میں پانی بھر بھر کر لکانے سے سینہ پر نیل کے داغ پڑ گئے تھے۔ ایک دن انہوں نے حاضر ہو کر پدر بزرگوار سے ایک خادمہ کی خواہش ظاہر کی، ارشاد ہوا: اے فاطمہ! اب تک صفہ کے غریبوں کا انتظام نہیں ہوا ہے تو تمہاری درخواست کیونکر قبول ہو۔ دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا: فاطمہ! بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے۔

ایک دفعہ آپ کے پاس چادر نہ تھی، ایک صحابیہ ؓ نے لا کر پیش کی۔ اسی وقت ایک صاحب نے کہا کیسی اچھی چادر ہے، آپ نے فوراً اتار کر ان کے نذر کر دی۔ ایک صحابی ؓ کے گھر کوئی تقریب تھی مگر کوئی سامان نہ تھا، ان سے کہا عائشہ کے پاس جا کر آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ، وہ گئے اور جا کر لے آئے حالانکہ آپ کے گھر میں آٹے کے سوارات کے کھانے کو کچھ نہ تھا۔ ایک دن صفہ کے غریبوں کو لے کر سیدہ عائشہ ؓ کے گھر تشریف لائے اور فرمایا: جو کچھ کھانے کو ہو لاؤ، پکا ہوا کھانا حاضر کیا گیا وہ کافی نہ ہوا، کوئی اور چیز طلب کی تو چھوہارے کا حریرہ پیش ہوا، پھر پیالہ میں دودھ آیا مگر یہی سامان مہمانی کی آخری قسط گھر میں تھی۔

توکل و اعتماد کی روشن مثال

اللہ پر اعتماد، توکل اور بھروسہ کی شان دیکھنا ہو تو محمد رسول اللہ ﷺ میں دیکھو۔ حکم تھا جس طرح اولوالعزم پیغمبروں نے صبر و استقلال دکھایا تو بھی دکھا۔

نبی اکرم ﷺ ایک ایسی جاہل اور اَن پڑھ قوم میں پیدا ہوئے تھے جو اپنے معتقدات کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی تھی اور اس کے لیے مرنے مارنے پر تیار ہو جاتی تھی، مگر آپ ﷺ نے اس کی کبھی پروانہ کی۔ عین حرم میں جا کر توحید کی آواز بلند کرتے تھے اور وہاں سب کے سامنے نماز ادا کرتے تھے۔ حرم محترم کا صحن قریش کے رئیسوں کی نشست گاہ تھا آپ ﷺ ان کے سامنے کھڑے ہو رکوع و سجود کرتے تھے۔ جب آیت: (اے محمد! جو تم کو حکم دیا جاتا ہے اس کو علیٰ الاعلان سنا دو) نازل ہوئی تو آپ نے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر تمام قریش کو پکارا اور اللہ تعالیٰ کا حکم پہنچایا۔

قریش نے آپ کے ساتھ کیا کیا نہ کیا۔ کس کس طرح کی اذیتیں نہیں پہنچائیں۔ جسم مبارک پر صحن حرم کے اندر نجاست ڈالی۔ گلے میں چادر ڈال کر پھانسی دینے کی کوشش کی۔ راستے میں کانٹے بچھائے، مگر آپ کے قدم کو راہ حق سے لغزش ہونی تھی نہ ہوئی۔ ابو طالب نے جب حمایت سے ہاتھ اٹھا لینے کا اشارہ کیا تو آپ نے کسی جوش اور ولولہ سے فرمایا کہ چچا جان! اگر قریش میرے داہنے ہاتھ پر آفتاب اور بائیں ہاتھ پر ماہتاب بھی رکھ دیں تب بھی میں اس فرض سے باز نہ آؤں گا۔ آخر آپ کو مع بنی ہاشم کے پہاڑی درہ میں تین سال تک گویا قید رکھا گیا۔ آپ ﷺ کا، اور آپ کے خاندان کا مقاطعہ کیا گیا۔ اندر غلہ جانے کی روک تھام کی گئی۔ بچے بھوک سے بلبلاتے تھے۔ جوان درخت کے پتے کھا کھا کر زندگی بسر کرتے تھے۔ آخر آپ کے قتل کی سازش ہوئی یہ سب کچھ ہوا، مگر صبر و استقلال کا دامن آپ ﷺ کے ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ ہجرت کے وقت غار ثور میں پناہ لیتے ہیں کفار آپ کا پیچھا کرتے ہوئے غار کے منہ تک پہنچ جاتے ہیں بے یار و مددگار، نہتے محمد ﷺ اور مسلح قریش کے درمیان چند گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے، سیدنا ابو بکر ؓ گھبرا اٹھتے ہیں کہ یا رسول اللہ! ہم دو ہی ہیں لیکن ایک تسکین

سے بھری ہوئی آواز آتی ہے: ابو بکر دو نہیں تین ہیں **لاتحزن ان اللہ معنا** ۔ گھبراؤ نہیں ہمارا اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اسی ہجرت کے زمانے میں اثنائے راہ میں نبی اکرم ﷺ کی گرفتاری کے لیے سراقہ بن جعشم نیزہ ہاتھ میں لیے گھوڑا دوڑاتا ہوا آپ کے پاس پہنچ جاتا ہے، سیدنا ابو بکر ؓ کہتے ہیں یا رسول اللہ! ہم پکڑ لیے گئے۔ مگر وہاں محمد رسول اللہ ﷺ کے لب بدستور قرآن خوانی میں مصروف ہیں اور دل کی سکینت کا وہی عالم ہے۔

مدینہ پہنچ کر یہود کا، منافقین کا اور قریش کے غارتگروں کا ڈر تھا، لوگ نبی اکرم ﷺ کے مسکن کا راتوں کو پہرہ دیتے تھے کہ ایک دفعہ یہ آیت نازل ہوئی: ''یعنی اللہ تعالیٰ تجھ کو لوگوں سے بچائے گا۔'' اس وقت خیمے سے سر باہر نکال کر پہرے کے سپاہیوں سے فرمایا لوگو! واپس جاؤ مجھے چھوڑ دو کہ میری حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ نے لے لی ہے۔

غزوہ نجد سے واپسی میں آپ ﷺ ایک درخت کے نیچے آرام فرماتے ہیں، صحابۂ کرام ؓ ادھر اُدھر ہٹ گئے، ایک بدو تلوار کھینچ کر سامنے آتا ہے، آپ بیدار ہوتے ہیں موقع کی نزاکت دیکھو، بدو پوچھتا ہے بتاؤ اے محمد! اب کون تم کو میرے ہاتھ سے بچا سکتا ہے؟ اطمینان اور تسکین سے بھری ہوئی آواز آتی ہے کہ اللہ، اس پُراثر جواب سے دشمن متاثر ہو جاتا ہے اور تلوار نیام میں پہنچ جاتی ہے۔

بدر کا معرکہ ہے تین سو نہتے مسلمان ایک ہزار لوہے میں غرق قریشی لشکر سے نبرد آزما ہیں، مگر ان تین سو سپاہیوں کا سپہ سالار خود کہاں ہے؟ معرکہ کارزار سے الگ اللہ کی بارگاہ میں دست بدعا ہے کبھی پیشانی زمین پر ہوتی ہے اور کبھی ہاتھ آسمان کی جانب اٹھتے ہیں کہ اے اللہ! اگر آج یہ چھوٹی سی جماعت صفحہ عالم سے مٹ گئی تو پھر کوئی تیرا پرستار اس دنیا میں باقی نہ رہے

گا۔

ایسے مواقع بھی آئے کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ پیچھے ہٹ گئے مگر اللہ کی نصرت اور مدد پر اعتماد کامل اور پورا بھروسہ رکھنے والا، پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہا۔ اُحد میں اکثر مسلمانوں نے قدم پیچھے ہٹا لیے مگر محمد رسول اللہ ﷺ اپنی جگہ پر تھے، پتھر کھائے، تیروں، تلواروں اور نیزوں کے حملے ہو رہے تھے، خود کی کڑیاں رخسار مبارک میں دھنس گئی تھیں، دندان مبارک شہید ہو چکا تھا، چہرۂ اقدس زخمی ہو رہا تھا مگر اس وقت بھی اپنا ہاتھ لوہے کی تلوار پر نہیں رکھا بلکہ اللہ ہی کی نصرت پر بھروسہ اور اعتماد رہا، کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری کا پورا یقین تھا۔

حنین کے میدان میں ایک دفعہ دس ہزار تیروں کا جب مینہ برسا تو تھوڑی دیر کے لیے مسلمان پیچھے ہٹ گئے مگر ذات اقدس اپنی جگہ پر تھی۔ ادھر سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی اور ادھر سے: ''میں پیغمبر ہوں جھوٹ نہیں ہے، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں''۔ کا نعرہ بلند تھا، سواری سے نیچے اتر آئے اور فرمایا میں اللہ کا بندہ اور پیغمبر ہوں اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

قارئین کرام! تم کو کسی اور ایسے سپہ سالار کا حال بھی معلوم ہے جس کی بہادری اور استقلال کا یہ عالم ہو کہ فوج کتنی ہی کم ہو، کتنی غیر مسلح ہو وہ اس کو چھوڑ کر پیچھے بھی کیوں نہ ہٹ گئی ہو، مگر وہ نہ تو اپنی جان کے بچانے کے لیے بھاگتا ہے اور نہ اپنی حفاظت کے لیے تلوار اٹھاتا ہے، بلکہ ہر حال میں زمین کی طاقتوں سے غیر مسلح ہو کر آسمان کی طاقتوں سے مسلح ہونے کی درخواست کرتا ہے۔

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

ایک شکاری نے کنڈی میں گوشت کی بوٹی لگا کر دریا میں پھینکی۔ایک مچھلی اسے کھانے دوڑی۔وہیں ایک بڑی مچھلی نے اسے روکا اور کہا:

''اسے منہ نہ لگانا، اس کے اندر ایک چھپا ہوا کانٹا ہے جو تجھے نظر نہیں آرہا۔ بوٹی کھاتے ہی وہ کانٹا تیرے حلق میں چبھ جائے گا، جو ہزار کوششوں کے بعد بھی نہیں نکلے گا۔ تیرے تڑپنے سے باہر بیٹھے شکاری کو اس باریک ڈوری سے خبر ہو جائیگی۔ تو تڑپے گی وہ خوش ہو گا، اس باریک ڈور کے ذریعے تجھے باہر نکالے گا، چھری سے تیرے ٹکڑے کریگا، مرچ مصالحہ لگا کر آگ پر ابلتے تیل میں تجھے پکائے گا۔10، 10 انگلیوں والے انسان 32، 32 دانتوں سے چبا چبا کر تجھے کھائیں گے۔ یہ تیرا انجام ہو گا۔''

بڑی مچھلی یہ کہہ کر چلی گئی۔ چھوٹی مچھلی نے دریا میں تحقیق شروع کر دی، نہ شکاری، نہ آگ، نہ کھولتا تیل، نہ مرچ مصالحہ، نہ دس دس انگلیوں اور بتیس بتیس دانتوں والے انسان، کچھ بھی نہیں تھا۔ چھوٹی مچھلی کہنے لگے:

''یہ بڑی مچھلی ان پڑھ جاہل، پتھر کے زمانے کی باتیں کرنیوالی، کوئی حقیقت نہیں اس کی باتوں میں۔ میں نے خود تحقیق کی ہے۔اس کی بتائی ہوئی کسی بات میں بھی سچائی نہیں۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے، وہ ایسے ہی سنی سنائی نام نہاد غیب کی باتوں پر یقین کیے بیٹھی ہے، اس ماڈرن سائنسی دور میں بھی پرانے فرسودہ نظریات لیے ہوئے ہے۔''

چنانچہ اس نے اپنے ذاتی مشاہدے کی بنیاد پر بوٹی کو منہ میں ڈالا، کانٹا چبھا، مچھلی تڑپی،

شکاری نے ڈور کھینچ کر باہر نکالا، آگے بڑی مچھلی کے بتائے ہوئے سارے حالات سامنے آ گئے۔

انبیا کرام علیہم السلام نے انسانوں کو موت کا کانٹا چبھنے کے بعد پیش آنے والے غیب کے سارے حالات وواقعات تفصیل سے بتا دیئے ہیں۔ بڑی مچھلی کی طرح کے عقلمند انسانوں نے انبیا کرام کی باتوں کو مان کر زندگی گزارنا شروع کر دی۔ چھوٹی مچھلی جیسے نظریات رکھنے والے انبیا کا راستہ چھوڑ کر اپنی ظاہری تحقیق کے راستے پر چل رہے ہیں۔ موت کا کانٹا چبھنے کے بعد سارے حالات سامنے آجائیں گے۔

مچھلی پانی سے نکلی واپس نہ گئی، انسان دنیا سے گیا واپس نہ آیا، بس یہی وقت ہے اگر سمجھ گئے تو۔۔۔

بقول شاعر:

آج لے ان کی پناہ آج مدد مانگ ان سے
پھر نہ مانیں گے قیامت میں اگر مان گیا

قارئین کرام! یہ زندگی ہمارے پاس اللہ رب العزت کی امانت ہے۔ ایک معینہ مدت میں دنیا، خواہشاتِ دنیا، نفس اور شیطان سے بچتے ہوئے اس امتحان گاہ سے گزرنا اور کامیاب ہونا ہے۔ اگر اس زندگی کو ظاہری کھیل تماشے میں گزار دیا اور اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل پیرا نہ ہوئے تو کل روز قیامت سوائے ندامت کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

ہمارے کچھ اہم معاملات

احادیث نبوی کی روشنی میں

علماء کا دین کا امین ہونا

امانت کی حفاظت نہ کرنے کی سزا

فرمایا: علماء دین کے امین ہیں، جب تک امراء سے نہ ملیں (یعنی ان سے تعلقات قائم نہ کریں) جب ان سے ملنے لگیں تو وہ دین کے رہزن بن جائیں گے۔ (أورده فی الموضوعات وتعقبه السیوطی فقال: وهذا الحدیث بمقتضی الصناعة حسن)۔

یہ حدیث شریف اس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کہ ایسے امر اجو دنیاوی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح دیتے ہوں، ان میں یہ تاثیر ہوتی ہے کہ ان سے ملتے رہنے اور ان سے تعلقات قائم کرنے سے مال کی ہوس (جو ہر فرد کے اندر میں چھپی ہوئی موجود ہوتی ہے) وہ ابھر کر سامنے آنے لگتی ہے، اور نہ چاہتے ہوئے بھی فرد میں یہ امنگ پیدا ہونے لگتی ہے کہ وہ ان جیسا بن جائے، علماء کرام، علم کے باوجود اگر ایسا کریں گے تو یہ ان کے دین کے لئے سخت خسارہ کا سودہ ہوگا، موجودہ دور میں اس سلسلے میں غیر معمولی احتیاط کی ضرورت ہے۔

علم پر عمل کرنے سے

مزید علم کا عطا ہونا

فرمایا: جو شخص اپنے علم پر عمل کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے ان چیزوں کا علم عطا فرماتا ہے جنہیں وہ نہیں جانتا اور اسے عمل خیر کی توفیق دیدیتا ہے، یہاں تک کہ وہ جنت کا مستحق بن جاتا

ہے، اور جو شخص اپنے علم پر عمل نہیں کرتا، وہ اپنے علم میں حیران رہتا ہے اور اسے عمل میں خیر کی توفیق حاصل نہیں ہوتی، یہاں تک کہ وہ دوزخ کا مستحق ہو جاتا ہے۔''

یہ حدیث شریف اپنے علم پر عمل پر ابھارنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

حاصل شدہ علم پر عمل کی استعداد کا حاصل ہونا بہت بڑی سعادت ہے، اس سے نئے علم کی نوید سنائی گئی ہے، یہ نیا علم دراصل اعمال میں پوشیدہ نورانیت کی صورت ہوتی ہے، اس نورانیت سے علم کے نئے نئے نکات بھی حاصل ہوتے ہیں تو ساتھ ساتھ اعمال صالحہ کی استعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے، دراصل اعمال میں جان، توانائی اور روح اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب اللہ سے تعلق مستحکم ہوتا ہے، اس سے شخصیت میں نورانیت آجاتی ہے، علم کا حاصل، اعمال صالحہ کی استعداد کا حاصل ہونا ہے، لیکن اگر علم سے یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے تو سمجھنا چاہئے کہ شخصیت میں تزکیہ نفس کا خلا موجود ہے، اس خلا کو پُر کرنے کے لئے ذکر و فکر کے کثرت کی ضرورت ہے۔

اکثر گناہوں کا زبان سے ہونا

فرمایا، انسان کے اکثر گناہ زبان کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

فرمایا: جو چپ رہا، اس نے نجات پائی۔

فرمایا، جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہئے کہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔

فرمایا، زبان کا غلط استعمال لوگوں کو منہ کے بل جہنم میں ڈال دے گا۔

فرمایا: جب انسان صبح کرتا ہے تو سارے اعضا اسے عرض کرتے ہیں کہ ہم تیرے تابع ہیں تو ہمارے متعلق اللہ سے ڈر، اگر تو سیدھی رہی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے، اگر تو ٹیڑھی ہو گئی تو ہم بھی ٹیڑھے ہو جائیں گے۔

یہ چار احادیث زبان کے سلسلے میں ہیں۔

زبان سے متعلق فتنہ اور شر ایسا ہے، جو ہم سب کے ساتھ لگا ہوا ہے، اس کو لگام دینے کی جتنی کوشش کرتے ہیں، یہ اسی قدر بے قابو ہو جاتی ہے، یہ زبان نیک اعمال کو غارت کرنے کا ذریعہ بنتی ہے، یہ زبان اپنی شخصیت کی برتری کے اظہار اور دوسروں کی تحقیر کا موجب بنتی ہے، یہ زبان دوسروں کی گلا وغیبت کے ذریعہ اپنے نیک اعمال دوسروں کے کھاتے میں ڈالنے کا سبب بنتی ہے، اس طرح زبان کی وجہ سے فرد کا مسکن جہنم ہو جاتا ہے۔

بس زبان کے سلسلے میں اللہ سے ہی فریاد کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے فضل خاص سے اس کے شر سے بچالے، ورنہ (یعنی اگر فضل خاص نہ ہو) تو زبان کا قابو میں آنا محال تر امر ہے، اللہ نے کثرت ذکر میں یہ نورانیت رکھی ہے کہ اس سے زبان، شر سے بچ جاتی ہے، لیکن فرد جوں ہی ذکر سے تھوڑا سا بھی غافل ہوا، یہ زبان چلنے لگتی ہے، زیادہ نہیں تو غیر ضروری گفتگو سے تو وہ بچ ہی نہیں سکتی۔ حقیقی اہل اللہ کی روزمرہ صحبت ہو تو اس کے شر سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس طرح کے اہل اللہ کی صحبت نصیب فرمائے۔

فتنے کو جگانے والے پر لعنت کا ہونا

فرمایا: فتنہ سویا ہوا ہے، جس نے اسے جگایا اس پر لعنت ہو۔ (جامع صغیر حدیث: ۵۹۷۵)

حدیث کا مفہوم غالبا یہ ہے کہ اغراضات، مفادات، دوسروں پر اپنی انانیت کو مسلط کرنے کے جذبات، قومی وجماعتی عصبیت اور ذاتی عصبیت کی صورت میں فتنہ سوئی ہوئی حالت میں موجود ہوتا ہے، اس فتنے کو جگانا، اسے للکارنا اور چیلنج دینا، یہ فتنے کو ہوا دینے کے مترادف ہے، اس سے افراد کا افراد سے اور قوموں کا قوموں سے اور جماعتوں کا جماعتوں سے ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔

دوسروں کو مشتعل کرنے اور للکارنے سے بچنے کا اہتمام ہونا انتہائی ضروری ہے، ورنہ سویا ہوا فتنہ بیدار ہو کر فساد برپا کرنے کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

علم کو غیر خدا کے واسطے حاصل کرنے کی سزا

فرمایا: جس نے علم کو غیر خدا کے واسطے حاصل کیا اور جس نے علم کے ذریعہ غیر خدا کی رضا جوئی کا ارادہ کیا تو اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں تلاش کرے۔ (سنن ابي داود/كِتَاب الْعِلْمِ/حديث: ۳۶۶۴)

فرمایا: جس نے علم اس غرض کے لئے حاصل کیا کہ اہل علم کے درمیان عزت وفخر حاصل کرے اور بے علموں کا ناطقہ بند کرے اور لوگوں میں نام ونمود حاصل کرے تو اسے اللہ جہنم میں داخل کرے گا۔(الترمذي الرقم/۲۶۵۴)

موجودہ دور میں علم نے جو صورت اختیار کی ہے، وہ نہایت المناک ہے، علم کو دولت اور برتری حاصل کرنے کا ذریعہ بنالیا گیا ہے، دولت اور ایک دوسرے پر برتری کی کوششوں کی وجہ سے ہر جگہ تصادم کی صورتحال پیدا ہوگئی ہے، دینی مدارس پھر بھی بہت غنیمت ہیں، لیکن مادیت پسندی کی عمومی فضا کے غلبہ کی وجہ سے دینی مدارس میں بھی تربیت کا فقدان ہوگیا ہے، علم میں جب تک خود شناسی اور خدا شناسی کا خصوصی اہتمام نہ ہوگا، تب تک علم خیر وبرکت کا باعث نہیں ہوسکتا اور نہ چاہتے ہوئے بھی ایسا علم دنیاوی اغراض کا ذریعہ بن جائے گا۔

فرد کا دوست کے دین پر ہونا

فرمایا: فرد، دوست کے دین پر ہوتا ہے، اس لئے دوست کے انتخاب میں احتیاط کرو۔(أبو داود۴۸۳۳)

یہ نہایت اہم حدیث ہے کہ فرد دوست کے دین پر ہوتا ہے، آج کل دوستی کا جو ماحول میسر ہے، وہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے والا ماحول ہے، اس ماحول میں فرد، از خود مادیت کی راہ پر گامزن ہونے لگتا ہے، بہتر دوستی کا ماحول میسر ہوجائے، تاکہ زندگی اسلامی خطوط پر تشکیل ہونے لگے، اس کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، لیکن ایسا کئے بغیر چارہ کار بھی نہیں۔

کثرت سے دنیا کے آنے سے بغض کا پیدا ہونا

فرمایا: دنیا جس گروہ میں بھی آئے گی، اللہ تعالیٰ ان کے درمیان دشمنی اور بغض پیدا کرے گا، (یعنی خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں) جس قدر دنیا کی محبت کم ہوگی، اسی قدر عداوت بھی کم ہوگی۔

یہ حقیقت ہے کہ دولت جہاں بھی آتی ہے، وہاں جھگڑے پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں، جس خاندان، جس ادارہ اور جس جماعت و گروہ میں دولت آئے گی، وہاں باہمی رسہ کشی پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی، اس طرح دولت کی وجہ سے خاندانوں اور اداروں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا گیا ہے، ہاں، جہاں اللہ کی محبت، دولت پر غالب ہے، وہاں حالت بہتر ہے۔

حسن اخلاق کی اہمیت

فرمایا: قیامت کے دن مسلمان بندے کے ترازو میں حسن اخلاق سے بڑھکر کوئی چیز وزنی نہ ہوگی۔(رواہ أبو داود۴۷۹۹)

الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ یہ حدیث اس سے پہلے بھی آچکی ہے، حسن اخلاق کی خاصیت یہ ہے کہ فرد بہت سارے گناہوں سے بچا رہتا ہے اور حسن اخلاق بہت ساری نیکیوں کے صدور کا ذریعہ بن جاتا ہے، حسن اخلاق سے فرد دوسروں کے لئے راحت کا موجب بنتا ہے، اس لئے حسن اخلاق کا ترازو میں وزنی ہونا یقینی بات ہے، لیکن حسن اخلاق کا حامل ہونا آسان بات نہیں ہے، اس کے لئے نفس امارہ سے روزانہ محاذ آرائی کرنی پڑتی ہے، شخصیت، نفس کی قوت سے آزاد ہو جائے تو اس کے بعد ہی کہیں جا کر حسن اخلاق کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔

تنہائی میں ذکر کی اہمیت

فرمایا: تمہیں ایسی بات نہ بتاؤں، جس پر دین کا دارومدار ہے، جس سے تم دنیا وآخرت کی بھلائی حاصل کر سکتے ہو؟ ایک اہل ذکر کی مجلس میں شرکت، دوسرے تنہائی میں ذکر کرنا۔(شعب الایمان ، حدیث :۹۰۲۴)

اہل ذکر کی مجلس میں شرکت کی مستقلا سعادت کا حاصل ہونا اور اپنے طور پر ذکر کرتے رہنا، یہ وہ بنیاد ہے، جس پر دین کی عمارت قائم ہوتی ہے، ان دونوں کاموں سے ہی اسلام کے لئیے مطلوبہ انسان تیار ہوگا۔

آج ان دونوں کاموں سے دوری کا نتیجہ ہے کہ جدید انسان، مادیت اور نفس پرستی کی یلغار کی زد میں ہے اور اسلامیت رخصت ہوگئی ہے، یہ اس دور کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔

دنیا سے بے رغبتی اختیار کرنے والے شخص کی صحبت کی اہمیت

فرمایا: جب تم کسی ایسے شخص کو دیکھو، جسے دنیا سے بے رغبتی اور کم گوئی عطا کی گئی ہے تو اس کی صحبت اختیار کرو، اس لئے کہ اس کو حکمت عطا کی جاتی ہے۔ (ابن ماجہ تحفۃ الأشراف: ۱۱۸۹۹،)

دنیا سے بے رغبتی اور کم گوئی کی خصوصیات کا ہونا اور اس کے نتیجے میں حکمت کا عطا ہونا، یہ ایسی نعمتیں ہیں جو اللہ کا عطیہ ہیں، اس طرح کی شخصیت کی صحبت سے ہی دنیا سے بے رغبتی اور حکمت عطا ہو سکتی ہے، ورنہ اپنی کوششوں سے دنیا کی محبت سے بچنا محال تر ہے، اللہ ہمارے لئے اس طرح کی شخصیت تک رسائی کی صورت پیدا فرمائے۔

تم میں سے بہتر شخص

فرمایا: تم میں بہتر وہ ہے جو اپنے بال بچوں کے لئے بہتر ثابت ہو۔ (ترمذی ۵۰/۴۷، حدیث: ۳۹۲۱)

فرد کی عام طور پر حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ گھر سے باہر دوستوں کے ساتھ تو بہتر حالت میں ہوتا ہے، لیکن گھر والوں کے لئے وہ سخت ہوتا ہے، اس کا سارا غصہ گھر والوں کے لئے ہوتا ہے، جس سے گھر کا ماحول کشیدہ ہونے لگتا ہے، ہمیں اس حدیث کا مصداق ہونا چاہئے۔

دنیا میں پردیسی کی طرح رہنا

فرمایا: دنیا میں ایسے رہو، جیسے تم پردیسی ہو یا راستہ چلتے مسافر۔ (سنن الترمذی ۲۳۳۳)

دنیا کی زندگی کو خوشحال سے خوشحال تر بنانے کی فکرمندی سے بچنا انتہائی ضروری ہے، اس کی غیر معمولی طور پر تاکید فرمائی گئی ہے، اس لئے کہ ایسے فرد کا زیادہ وقت دنیا کی فکرمندی میں چلا جاتا ہے۔

خود بینی اور دعویٰ کا خطرہ

فرمایا: اگر تم سے گناہ صادر نہ ہوں تو مجھے تمہارے بارے میں اس سے زیادہ سخت چیز کا خطرہ ہے اور وہ خود بینی اور دعویٰ ہے۔"

بندہ مومن کا، کوشش کے باوجود گناہوں سے بچنا دشوار ہوتا ہے، خاص طور پر زبان کو کنٹرول کرنے کے معاملے میں وہ کمزور ہوتا ہے، چنانچہ گناہوں سے اسے شدید اذیت ہوتی ہے، آہ وزاری کرنے کے بعد کہیں جا کر اسے سکون ملتا ہے، اس میں یہی حکمت سمجھ میں آتی ہے کہ اگر گناہ نہ ہوں تو پھر اپنے عابد اور متقی ہونے اور دوسروں کے حقیر ہونے کا تصور ابھرنے لگتا ہے، جو دعویٰ ہے۔

دل میں کھٹکا پیدا ہونے والے عمل کو چھوڑنے کی تاکید

فرمایا: جس چیز سے تمہارے دل میں کھٹکا پیدا ہو، اسے چھوڑ دیا کرو، جس چیز میں کھٹکا پیدا نہ ہو، اسے اختیار کیا کرو۔(اخرجه الترمذي ٢٥١٨،)

اس حدیث میں تقویٰ کا عظیم معیار بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص کھٹکے والی چیز کو چھوڑ دے گا، وہ کبھی حرام میں داخل نہ ہو گا۔

محبت کرنے والے کو تکلیف میں مبتلا کرنے کی ادا

فرمایا: اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو اس کو کسی تکلیف میں مبتلا کر دیتے ہیں، تاکہ وہ اس کے عجز وزاری کو سنے۔"

اللہ کو بندے کی عجز وزاری کی حالت پسند ہے اور بندہ اگر مستقلا اس حالت میں رہے تو اس پر حالت عبدیت طاری ہو گی، جو سب سے بڑی سعادت ہے۔

نیت کا عمل سے بہتر ہونا

فرمایا: مومن کی نیت اس کے عمل سے زیادہ بہتر ہے۔(اَلْمُعْجَمُ الْكبِير ج٦ ص١٨٥ حديث ٥٩٤٢)

اس لئے کہ نیت میں آفت کا احتمال نہیں، جب کہ عمل میں ریا اور کبر وغیرہ کا شک ہوتا ہے، اس لئے نیت کو جتنا پاکیزہ بنایا جا سکتا ہے، بنایا جائے، اس سے عمل میں بھی اخلاص اور پاکیزگی آتی جائے گی۔

دنیا سے بغض رکھنا

فرمایا: اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے تو دنیا سے بغض رکھو، اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ تم سے محبت کریں تو دنیا کو انہی کی طرف پھینک دو۔(تفرد بہ ابن ماجہ، تحفة الأشراف:۴۶۸۷)

دنیا سے بغض اور بے رغبتی کا ہونا، خوش نصیب افراد کا کام ہے، ہم جیسے سیاہ کار افراد تو ہر وقت دنیا کی فکر مندی میں لگے رہتے ہیں، اللہ کی محبت غالب ہو تو یہ حالت ختم ہو سکتی ہے، دوسری صورت میں دنیا کی محبت سے بچنا دشوار تر ہے۔

غذا اور صحت کا انعام ہونا

فرمایا: اگر تجھے غذا حاصل ہے اور صحت اور امن بھی، اس کے باوجود تم غم میں مبتلا ہو تو تم سے غم کبھی دور نہ ہوگا۔"

جسے یہ نعمتیں حاصل ہیں، اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے، ان نعمتوں کے باوجود حالت غم میں رہنا، یہ اس بات کی علامت ہے کہ فرد کا دل نعمتوں کی قدر دانی سے محروم ہے، دل کی یہ محرومی اللہ کے ذکر سے ہی دور ہو سکتی ہے، اور اللہ کی نعمتوں کی قدر دانی کی صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے۔

قلب پر غبار کا چھا جانا

فرمایا: میرے قلب پر بھی غبار چھا جاتا ہے، سو، میں شب و روز میں ستر بار استغفار کرتا ہوں۔(صحیح مسلم)

منتہی پر بھی تغیرات طاری ہوتے ہیں، جو اس کی شان کی مناسبت سے ہوتے ہیں، سالک کو ان سے تنگ نہ ہونا چاہئے، جب تک وہ معاصی تک نہ پہنچادیں۔اس حدیث سے تنگی کے وقت استغفار سے کام لینے کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے، البتہ مبتدی کی تنگی ذکر سے ہی دور ہوگی منتہی کی استغفار سے۔

بندہ مومن کے نور کی اہمیت

فرمایا: قیامت کے دن جہنم کہے گی، اے بندہ مومن تو جلدی سے گزر جا، کیونکہ تیرا نور میری آگ کی تیزی کو ٹھنڈا کیے دیتا ہے۔(الکامل ابن عدی۱۳۱۸)

جس بندہ مومن کی یہ شان ہوگی، اس سے بڑھکر خوش نصیب کون ہوگا، ہم جیسے سیاہ کاروں کے لئے جہنم سے لرزاں وترساں رہنے میں ہی عافیت ہے۔

نفس کے عیوب سے آگاہ کرنے کی خوش خبری

فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی کے لئے خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دنیا سے زہد (بے نیاز) اور آخرت میں راغب کردیتا ہے اور اسے نفس کے عیوب سے آگاہ کردیتا ہے۔(بحار الانوار :۳/۸۰/۷۷)

دنیا سے بے نیازی اور نفس کے عیبوں سے آگاہ کرنے کی سعادت کا حاصل ہونا، ساری سعادتوں پر بھاری ہے، یہ سعادت خوش نصیب ترین افراد ہی کو عطا ہوتی ہے، یہ دونوں نعمتیں ایسی ہیں جو اگر زندگی بھر کے مسلسل مجاہدوں کے نتیجے میں حاصل ہوں تو سستا سودہ ہے، مجاہدوں کی یہ توفیق جس سے یہ دونوں نعمتیں وابستہ ہیں، وہ بھی اس کے فضل خاص سے ملتی ہے، اس لئے اس سے اس کا فضل خاص مانگتے رہنا چاہئے۔

اللہ سے حیا کرنے کے بارے میں

فرمایا: اللہ سے حیا کرو، جیسا کہ اس سے حیا کرنے کا حق ہے، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ہم تو اللہ تعالیٰ سے حیا کرتے ہیں، آپ نے فرمایا، یہ بات نہیں، تم وہ عمارتیں بناتے ہو جن میں رہنا نہیں، وہ اموال جمع کرتے ہیں جو کھاتے نہیں۔(أخرجه الترمذي ۲۴۵۸،)

اس حدیث شریف میں حیا کی ایک نئی صورت کا ذکر فرمایا گیا کہ اللہ سے حیاء کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ دنیا کی اصل حیثیت کو سمجھا جائے کہ وہ ایک گزرگاہ ہے، مستقل رہنے کی جگہ نہیں ہے، دنیا میں ہماری حیثیت مسافر کی سی ہے، مسافر نہ تو بڑی بڑی عمارتیں بناتا ہے اور نہ ہی مال جمع کرتا ہے، اسے اصل فکر ابدی زندگی کی ہوتی ہے کہ وہاں اللہ کے سامنے جواب دہی کرنی ہے، اللہ سے حیا کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کو عارضی اور ثانوی حیثیت دے کر اسے آخرت کی تیاری کا ذریعہ بنایا جائے۔

دنیا کے لئے اتنا کرو، جتنا دنیا میں رہنا ہے

فرمایا: دنیا کے لئے اتنے کام کرو، جتنا تجھے اس میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنے کام کرو، جتنا وہاں رہنا مقدر ہے۔"

قرآن واحادیث میں دنیا کی عارضی زندگی اور آخرت کی ابدی زندگی کو مختلف طریقوں سے اجاگر کرنے کی کوشش فرمائی گئی ہے، تاکہ بندہ مومن دنیا میں کھو کر، آخرت سے غافل نہ ہو جائے۔

بندہ کی، اللہ سے محتاجی

فرمایا: اللہ کے لئے اتنے کام کرو، جتنا تم اس کے محتاج ہو اور دوزخ کے لئے اتنے کام کرو، جتنا تم اس کی تکلیف پر صبر کر سکتے ہو۔ (مشيخة قاضي المارستان ۳/ ۱۰۴۴)

فرد تو ہر وقت اور ہر معاملے میں اللہ کا محتاج ہے، اللہ کے فضل کے بغیر تو اس کا کوئی معاملہ سدھر ہی نہیں سکتا، دنیا میں تو فرد اللہ کا محتاج ہے ہی، لیکن آخرت میں تو اللہ کی محتاجی اور اس کے فضل خاص کے بغیر اس کی نجات ممکن ہی نہیں۔

جب بندہ، زندگی کے ہر قدم پر اللہ کا محتاج ہے تو اسے اپنی عملی زندگی میں اللہ کی اس محتاجی کا مظہر ہونا چاہئے، یعنی اللہ کی عبادت واطاعت کو زندگی کا وظیفہ بنانا چاہئے۔

ذکر کی توفیق کا سب سے بڑا انعام ہونا

فرمایا: اللہ تعالیٰ کی روزانہ کی بہت ساری نعمتیں ہیں، جو وہ اپنے بندوں پر انعام کی صورت میں کرتا رہتا ہے اور اس نے اپنے کسی بندے کو اپنے ذکر کی توفیق سے بڑھکر کوئی نعمت عطا نہیں کی ہے۔(الدعاء الطبراني ص:۵۲۰)

ذکر کی توفیق کا مسلسل اور مستقل طور پر حاصل ہوتے رہنا اور زندگی کے کسی بھی موڑ پر اس سے غافل نہ ہونا، یہ سب سے بڑی نعمت ہے، اس لئے کہ ذکر زندگی کے سارے پہلوؤں کو بدل کر اسلام سے ہم آہنگ بنانے کا کردار ادا کرتا ہے، ذکر میں محویت کا حامل فرد اللہ سے اتنا مانوس ہو جاتا ہے کہ غیر اللہ کی نفی اس کے مزاج کا حصہ بننے لگتی ہے، ذکر سے جہاں سکون وسکینت حاصل ہوتی ہے، وہاں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے سانچے میں ڈھلا ہوا فرد بھی تیار ہو جاتا ہے، ذکر کی مسلسل توفیق کا ملنا، اس کو ساری نعمتوں سے بڑھکر نعمت قرار دینا، یہ ہر اعتبار سے بجا ہے، ایسا فرد دنیا کی بھول بھلیوں میں پھنسنے سے بچا رہتا ہے، اللہ کے ذکر کے انوار اس کا احاطہ کر لیتے ہیں، وہ انوارِ معرفت کی حالت میں زندگی گزار کر اللہ سے ملاقاتی ہوتا ہے، اللہ ہمیں ایسے خوش نصیب افراد میں شامل فرمائے۔

اللہ کے لئے تواضع اختیار کرنے سے بلندی کا عطا ہونا

فرمایا: جو شخص اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے بلندی عطا فرماتے ہیں۔ (صحیح مسلم)

اللہ کے لئے تواضع اختیار کرنے میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے دلیں قدر دان اور مفتوح ہوتی ہیں، تواضع جتنی زیادہ ہوگی، اسی قدر اللہ کی طرف سے دلوں میں محبت ڈال دی

جاتی ہے، اور ایسے افراد کی طرف دلیں کھینچنے لگتے ہیں، یہ تواضع کے نتیجے میں ملنے والا انعام ہوتا ہے۔

آخرت میں پسندیدہ لباس کا پہنانا

فرمایا: جس نے قدرت (وسائل) کے باوجود تواضع اختیار کرتے ہوئے عمدہ لباس نہیں پہنا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے ساری مخلوق کے سامنے بلائیں گے اور وہ جو لباس پسند کرے گا، اسے پہننے کا اختیار دیا جائے گا۔ (رواه الترمذي وأحمد)

عام طور پر بزرگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ سادہ سے سادہ لباس پہنتے ہیں، یہ دراصل ان کی تواضع کی علامت ہوتی ہے، وہ اس دنیا کی نعمتوں کو اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

بہت سارے مسلمانوں کے ایمان کا افلاس سے وابستہ ہونا

فرمایا: بہت سے مسلمان ایسے ہیں کہ ان کا ایمان افلاس ہی سے باقی ہے، اگر اللہ تعالیٰ ان کو غنی کر دیں تو وہ اس قدر سرکشی اختیار کریں کہ کفر تک پہنچ جائیں، اور بہت سے ایسے ہیں کہ ان کا ایمان ان کے غنا کی وجہ سے محفوظ ہے، اگر ان پر افلاس آجائے تو وہ کفر والحاد میں مبتلا ہو جائیں، بہت سے مریض ایسے ہیں کہ ان کا دین مرض کی وجہ سے سالم ہے، اگر وہ تندرست ہو جائیں تو دنیا میں پڑ کر اللہ کو بھول جائیں، اور بہت سے تندرست ایسے ہیں کہ ان کا دین صحت کی وجہ سے ہے۔ (حلية الاولياء، الحسين بن يحى الحسينى، ۳۵۵/۸، الحديث: ۱۲۴۸۵)

اس حدیث شریف میں اللہ کے حکمت کے نظام کو بیان فرمایا گیا ہے، انسانوں کے بارے میں اللہ ہی جانتا ہے کہ کس فرد کے لئے کیا صورت بہتر ہے، بیماری، صحت، افلاس یا مالداری، بس اللہ سے عافیت، معافی اور آسانی کی دعا کرتے رہنا چاہئے، انسان زیادہ تکلیف کا متحمل نہیں ہے۔

دنیا کا ملعون ہونا

فرمایا: دنیااور جو کچھ دنیامیں ہے وہ سب ملعون ہے، سوائے اللہ کے ذکر ہے۔(تحفة الأشراف:۱۳۵۷۲)(حسن)

یہ حدیث شریف مختصر ہونے کے باوجود بہت جامع ہے اور ذکر کی اہمیت کے حوالے سے نہایت موثر ہے، اس حدیث شریف کی اہمیت کا صحیح ادراک وہی فرد کر سکتا ہے، جو ذکر کر کے ذکر سے غافل ہو گا، اس لئے کہ ذکر سے وہ انوار کی حالت میں رہتا ہے، جس سے ہر طرح کی اطاعت آسان ہونے لگتی ہے، مزاج میں نرمی پیدا ہونے لگتی ہے، اخلاق حسنہ کا صدور ہونے لگتا ہے، لیکن جوں ہی وہ ذکر سے غافل ہونے لگتا ہے اور غفلت کا وقفہ بڑھنے لگتا ہے تو اس سے اس کے دل پر تاریکی اور ظلمات چھانے لگتے ہیں، مزاج میں چڑچڑاپن آنے لگتی ہے، اطاعت دشوار تر ہونے لگتی ہے، یہ ذکر کرنے والے کا آئے دن کا مشاہدہ ہے، دنیا کی ملعونیت ذکر (قرآن کی تلاوت بھی ذکر ہی کا حصہ شامل ہے) کی برکت سے ہی ختم ہونے لگتی ہے، اس کی دوسری کوئی صورت نہیں۔

دین کا خیر خواہی کا نام ہونا

فرمایا: دین صرف خیر خواہی کا ہی نام ہے۔(مسلم، ص ۵۱، حدیث:۱۹۶)

دین ایسا مزاج پیدا کرنا چاہتا ہے، جس میں دوسروں کے لئے خیر خواہی کے جذبات موجزن ہوں، یہ خیر خواہی افراد کی دینی اور ایمانی اعتبار سے بہتر حالت بنانے کے اعتبار سے ہو یا دنیاوی حالت بہتر بنانے کے رُو سے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس میں خیر خواہی موجود نہیں ہے، وہ دینی اعتبار سے کمزور حالت میں ہے، یا اس میں رسمی نوعیت کی دینداری ہے، جب حقیقی دینداری پیدا ہوتی ہے تو فرد دوسروں کی حالت زار دیکھکر بے قرار ہو جاتا ہے، اور

نہیں تو دوسروں کی حالت بدلنے کے لئے وہ دعاؤں کا سہارا لینے لگتا ہے، موجودہ دور میں دین کی اس حیثیت کو سمجھنا ضروری ہے۔